ثُمَّ اِنَّ عَلَینَا بَیَانَہٗ

مقامِ حدیث

جس میں

صداقت حدیث، ضرورت حدیث، جمع حدیث، تنقید حدیث

پر بحث ہے

مؤلفہ

مولانا مولوی محمد علی صاحب

مترجم انگریزی ترجمۃ القرآن مع تفسیر و اردو ترجمۃ القرآن

مع تفسیر وغیرہ

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام [illegible] نے شائع کیا

تعداد طبع ۱۰۰۰

بار دوم

فضل الباری جلد اوّل

یعنی

اُردو ترجمہ و حواشی صحیح بخاری

مصنّفہ

حضرت مولانا مولوی محمد علی صاحب ایم اے مولف ترجمۃ القرآن انگریزی و اُردو وغیرہ

بخاری شریف کے بابوں اور مضامین کو اس طرح رکھا گیا ہے کہ حجم بہت کم ہو گیا ہے۔ ترجمہ بامحاورہ ہے مضامین میں قرآن کریم کو اصل اور احادیث کو اس کے ماتحت رکھا گیا ہے۔ ہر قسم کے اعتراضات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسائل میں مختلف آراؤں میں سے جو معقول اور مدلل ہو اسے ترجیح دی گئی ہے مکرر احادیث پر صرف نمبر دیئے گئے ہیں۔ اور ان میں الفاظ کی کمی بیشی کو نوٹوں میں واضح کیا ہے۔ ضخامت ۲۲×۲۹/۸ ــ ۸۰۰ صفحہ قیمت مجلد سات روپے عہ بیجلد چھ روپے ۶

شمائل شریف مترجم اُردو

مترجمہ حضرت مولانا مولوی محمد علی صاحب ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

یہ شمائل شریف حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ بین السطور ترجمہ اور حاشیہ پر مختصر تفسیری نوٹ درج کئے ہیں۔ حضرت مولانا کی تفسیر بیان القرآن اس قدر مقبول ہوئی کہ لوگوں نے اس کا ایک مختصر ایڈیشن نکالنے کی فرمائش کی تاکہ یہ ترجمہ ہر طبقہ کے آدمی تک پہنچ سکے۔ کاغذ و لکھائی وغیرہ اعلیٰ۔

ہدیہ

قسم اول۔ مجلد سفید کاغذ ــ ــ عہ ــ قسم دوم۔ مجلد سفید کاغذ ــ ــ عہ

قسم سوم۔ مجلد سفید کاغذ ــ عہ ــ بیجلد [illegible] کاغذ ــ للعہ ــ بیجلد حنائی کاغذ للعہ

منیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

اس زمانہ میں مخالفین اسلام کے حملوں کو چھوڑ کر خود مسلمانوں نے حدیث کے معاملہ میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور اس کے صحیح مقام کو جس پر سلف قائم تھے اور جس کی طرف خود قرآن و حدیث ہم کو ہدایت کرتے ہیں نہیں سمجھا۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جس نے حدیث پر اس قدر زور دیا ہے کہ آخر آہستہ آہستہ قرآن شریف چھوٹ گیا۔ پھر کمزور سے کمزور حدیث کی بنا پر اصول دین تک کی پروا نہیں کی جاتی جو صراحت سے قرآن شریف میں مذکور ہیں۔ اور حدیث کو قرآن شریف کے ماتحت کرنے کے خیال کو حدیث کی بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی بروئے درایت یا عقلی طور پر تنقید حدیث کو ایک جرم خیال کیا جاتا ہے۔ اور جو کچھ رطب و یابس کمزور سے کمزور احادیث میں ہے۔ اس کو اصول دین کے برابر وقعت دیکر اس پر اعتراض کرنے والے کو دین اسلام کا منکر یعنی کافر قرار دیا جاتا ہے۔ مقام حدیث کے متعلق اسی غلو کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس زمانہ میں ایک گروہ مسلمانوں کا ایسا پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے بالمقابل تفریط کی راہ اختیار کر کے حدیث کی صداقت کا کلی انکار کر دیا ہے۔ اور خطرناک سے خطرناک حملہ جو کسی دشمن کو کبھی کرنے کی جرأت ہوئی ہو۔ اس سے بہت بڑھ کر حملہ صداقت حدیث پر مسلمانوں کے اس گروہ نے کیا ہے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت بیباکی سے حدیث کو سرتاپا مجموعہ ہزلیات

اور مفتریات قرار دیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ اس لئے مجھ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ برادران اسلام کے لئے اس بارہ میں صحیح راہ پیش کروں۔ تاکہ جس دین کو ہم دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں خود بھی اس کے اصول صحیحہ سے واقفیت حاصل کریں۔

میں نے اس مضمون کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل میں یہ بتایا ہے کہ صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے کیا حملے کئے ہیں۔ اور وہ حملے ایک سرسری تاریخی نگاہ سے کس سلوک کے مستحق ہیں۔

باب دوم میں صداقت حدیث پر دو قسم کی خارجی شہادت پیش کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی حفاظت میں اس کے بیان کرنے والوں نے کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔

باب سوم میں ضرورت حدیث کے مضمون کو بیان کیا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ قرآن شریف کے ہوتے ہوئے حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ اور کیوں حدیث کو وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

باب چہارم میں جمع حدیث کا مضمون ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ حدیث کی کس طرح حفاظت کی گئی۔ کب اس کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا اور کن مرحلوں میں سے گزر کر یہ تکمیل کو پہنچا۔

باب پنجم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ محدثین نے کس طرح علاوہ تنقید روایت کے بڑے درایت بھی حدیث کی تنقید کی ہے اور اب ہمارے لئے حدیث کی تنقید کے کیا سامان ہیں۔ اور کس حد تک ہم حدیث کو قبول کر سکتے ہیں۔

محمد علی

اس کتاب کی طبع ثانی کی ضرورت محسوس ہونے پر میں نے اس پر دوبارہ نظر کی ہے۔ اور بعض بعض مقامات پر خفیف تغیر و تبدل بھی کیا ہے۔

محمد علی

۱۲۔ جون ۱۹۳۲ء

پہلا باب

صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی حملے

حدیث پر اندرونی اور بیرونی اعتراض

حدیث کی صداقت اور اعتبار پر اس زمانہ میں دو قسم کے حملے ہوئے ہیں۔ ایک بیرونی اور دوسرے اندرونی۔ بیرونی حملے سر ولیم میور اور سپرنگر وغیرہ عیسائی مصنفین کی طرف سے ہوئے ہیں اور اندرونی حملے مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی طرف سے اور کسی قدر آزاد خیال لوگوں کی طرف سے ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ قیاس ہونا چاہیئے تھا کہ اندرونی خیالات کا اثر بیرونی لوگوں پر پڑا ہو مگر یہاں صورت اس کے خلاف ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ جہاں بیرونی حملہ آوروں کو ایک حد تک حدیث کی صداقت اور اعتبار کا اعتراف ہے۔ اندرونی حملہ آور سارے عظیم الشان مجموعہ حدیث کو جس کے اندر بہت سا علم دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے برگزیدہ اصحاب کے حالات محفوظ ہیں۔ ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ بلکہ تمام کی تمام احادیث اور ان کے ہر ایک لفظ کو یا فعل کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے آپ پر بہتان و افترا قرار دیتے ہیں۔ اس مختصر رسالہ میں دونوں قسم کے اعتراضات کا جواب ہوگا۔

میور کا خیال کہ حدیث جنگوں میں قصہ گوئی سے پیدا ہوئی

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد (صلعم) میں احادیث کی بحث میں لکھتے ہیں۔ "محمد (صلعم) کی وفات کے بعد ان کے پیرووں کا سب سے بڑا شغل جنگ تھا ...... لمبی تھکا دینے والی مہمات جنگی کی ثقالت اور ایک جنگ سے دوسری جنگ تک بیکاری کا وقفہ ایک سادہ اور نیم وحشی قوم کے لئے غفلت شعاری کا موجب تھا۔ اسی ثقالت کے دور کرنے کا علاج اور ان وقفوں کا شغل بے تکلف بات چیت یا باقاعدہ گفتگو میں گذشتہ واقعات کی یاد تھی۔ ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ پرجوش گفتگو کا مضمون سوائے اس شخص کے اقوال اور افعال کے اور کیا ہو سکتا تھا جو اس فاتح قوم کے وجود میں آنے کا موجب ہوا تھا اور جس نے ان کے ہاتھ میں اس دنیا اور بہشت دونوں کی کنجیاں دے دی تھیں۔ اس طرح پر محمد (صلعم) کے پیرووں کی گفتگو زیادہ تر انہی کے متعلق ہوتی تھی ...... یہ وہ مواد تھا جس سے حدیث نے خوب ترقی کی۔"

جنگی شغل والے صحابہ کی حدیث میں روایت

اس مضمون میں میور نے بڑی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے۔ مگر اکثر عیسائی مصنفین کی طرح گو اس خیال کی ایجاد میں انہوں نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اور اس کو خوب سجا کر ایک خوشنما رنگ میں پیش کیا ہے جس سے ایک ناواقف آدمی کو ٹھوکر لگ سکتی ہے۔ لیکن واقعات تاریخی پر ایک سرسری نگاہ میور صاحب کی اس رنگ آمیزی کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ جنگوں کے اندر بے شغلی کے زمانہ میں یہ کہانیاں ایجاد ہوئیں تاکہ لوگوں کا وقت ان قصہ گوئیوں میں گذر جائے اور بوجھل معلوم نہ ہو۔ حالانکہ جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی روایت میں ان لوگوں کا حصہ عشر عشیر سے بھی بہت کم ہے جن کا تعلق جنگوں سے تھا۔ بلکہ بیشتر حصہ احادیث کا ان صحابہ سے مروی ہے جن کا کام علوم دینی کی اشاعت اور درس و تدریس تھا۔ اور بڑے بڑے فاتحین اور سپاہیوں کی روایات کو اگر کوئی تلاش کرنا چاہے تو بہت ہی کم احادیث ان سے ملیں گی۔ ایک حضرت ابوہریرہ ہی کو لے لو جن سے سب سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں ان کا تعلق جنگوں سے کوئی نہ تھا نہ وہ جنگوں میں شامل ہوئے لیکن کل مجموعہ حدیث میں جن کی تعداد بلا تکرار کنز العمال میں تینتیس ہزار [۳۳۰۰۰] ہے۔ پانچ ہزار تین سو چوہتر [۵۳۷۴] حدیثیں ان سے مروی ہیں یعنی چھٹے حصے سے بھی زیادہ۔

بخاری میں کثرت روایات علمی اشغال والے صحابہ سے ہے

دوسری طرف حدیث کی سب سے معتبر کتاب لے لو اور دیکھو کہ اس میں ایسی حدیثیں کس قدر ہیں جن کی روایت ان صحابہ تک پہنچتی ہو جو جنگوں میں بہت حصہ لینے والے تھے اور ایسی احادیث کس قدر ہیں جو ان صحابہ تک پہنچتی ہوں جو جنگوں میں شریک نہ ہوتے تھے۔ دونوں قسموں میں سے پانچ چھ بڑے بڑے صحابہ کو لے لو۔ ایک طرف خالد بن ولید۔ ابوعبیدہ۔ ابوسفیان۔ یزید بن ابوسفیان عکرمہ۔ ضرار۔ ابن الازور ہیں۔ اور ان کے مقابل دوسری طرف ابوہریرہ، انس بن مالک۔ عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عائشہ صدیقہ اور خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اول الذکر گروہ میں سے بخاری میں صرف ایک حدیث ابوسفیان کی آئی ہے اور موخر الذکر گروہ میں سے حضرت ابوہریرہ کی ۴۴۶۔ انس بن مالک ۲۶۸۔ عبداللہ بن عمر ۲۷۰۔ عبداللہ بن عباس ۲۱۷۔ حضرت عائشہ صدیقہ ۲۴۲۔ دوسری عورتیں ۷۳۔ حضرت عمر ۶۰۔ حضرت علی ۴۹۔ حضرت ابوبکر ۲۲۔ حضرت عثمان ۹ کل ۱۶۴۶ ہیں۔ مقام غور ہے کہ یہ کتنا بڑا جھوٹ میور صاحب نے حدیث پر اعتراض کرنے کے لئے لکھ دیا ہے کہ جنگوں میں شامل ہونے والے لوگ قصہ گوئی کے طور پر حدیثیں بنا لیا کرتے تھے حالانکہ قصہ گوئی اور کہانت یہ وہ ہتھیار ہیں جو اسلام کے خلاف اس کے دشمنوں نے استعمال کئے

اور اسلام نے ان دونوں کا عرب میں سے خاتمہ کر دیا۔ یہ موقعہ زیادہ تفصیل کا نہیں۔ ہاں اس سے مجھے انکار نہیں کہ جنگوں میں شریک ہونے والے صحابہ سے بھی احادیث مروی ہیں جو نسبتاً بہت کم ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کوئی تنخواہ دار سپاہی نہ تھے کہ ساری عمر ہی ان کی جنگوں میں صرف ہوئی ہو بلکہ علمی اشغال بھی رکھتے تھے۔ اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال تھا کہ جہاں ان کو فاتح بنایا اور ملک گیری سکھائی ساتھ ہی حکمت اور علم کی چاشنی بھی لگا دی۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی کے خیالات کہ حدیث سینکڑوں برس بعد بنی

دشمن اگر زیادتی کرے تو اس پر اس قدر الزام نہیں جس قدر اس نادان دوست پر ہے جو اپنے ہاتھ سے اس شاخ کو کاٹتا ہے جس پر وہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ پاک علوم وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق۔ وہ پاکیزگی اور طہارت کی باتیں جن سے حدیث بھری پڑی ہے۔ ان کے متعلق "اہل قرآن" کے پیش رو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کی طرف سے ذیل کا فتویٰ صادر ہوتا ہے۔

"فی الحقیقت حدیث میں اس قدر لغویات ہزلیات اور دوراز کار اور بے سروپا باتیں مندرج ہیں کہ وہ اس کی شکل کو نہایت ہی بدنما بناتی ہیں۔ لیکن واضعین احادیث نے یہ بڑی کاریگری کی کہ اس کو خاتم النبیین کی طرف منسوب کر دیا اور اس طرح اس کے بدشکل چہرہ پر سفیدہ مل دیا" (برہان الفرقان صہ ۱۹)

"نہ صرف زمانہ محمد رسول اللہ سلام علیہ کے لوگ ہی کتاب اللہ کے مقابلہ میں احادیث انبیاء پیش کرتے تھے۔ بلکہ یہ ملعون کام اس سے بھی پرانا ہے .... فرعون بھی اہل حدیث ہی تھا اور موسیٰ سلام علیہ کے مقابلہ میں یوسف سلام علیہ کی احادیث پیش کرتا تھا اور ان کو ختم المرسلین جانتا تھا"

(برہان الفرقان صہ ۱۷)

"حدیث کی تشریح و تفصیل کتاب اللہ المجید کے سراسر مخالف ہے..... اس وجہ سے مجھے اس بارہ میں شک ہوا کہ حدیث محمد رسول اللہ سلام علیہ کا قول فعل تقریر نہیں ہے..... اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت ہی کریہ النظر بدصورت زشت رو بدشکل مصنوعی چیز ہے۔ اس کو رسول اللہ سلام علیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے بعض خود غرض لوگوں نے از خود یہ ہزلیات گھڑ لیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ سلام علیہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ یہ کام زیادہ تر بعض یہودی و نصاریٰ دشمنان اسلام کا معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کی بیخکنی کی یہ بہترین راہ سوچی کہ وہ مسلمانی کے لباس میں لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف سے ہٹا کر اور طرف لگا دیں تاکہ ان میں بھی وہی کفریات جاری ہو جائیں جو خود اُن کے باطل مذاہب میں موجود تھیں" (الزکوٰۃ والصدقات صہ ۱۳ و ۱۲)

"غرضکہ جملہ کتب منزلہ من اللہ میں ہر ایک کتاب خصوصاً قرآن مجید جملہ احکام و تمام مسائل

دین اسلام کے بارہ میں مباحث تک بھی ہر طرح کامل مکمل مفصل و مشرح کافی شافی وافی عافی ہوتی ہے۔ ان کے کسی مسئلہ میں اجمال و اشکال نہیں ہوا" مناظرہ صفحہ ۱۸۔

"اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر بیان ہو گئی ہے تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عملدرآمد کرنا سراسر کفر شرک ظلم فسق ہے ...... ماسوائے احسن الحدیث کے یعنی کتاب اللہ المجید کے باقی سب کی سب احادیث دین اسلام کے بارہ میں جو جو مروی ہیں وہ ہر ایک لہو الحدیث میں ہی داخل ہیں۔ محمد رسول اللہ سلام علیہ عموماً جملہ رسل انبیاء سلام علیہم پر محض لوگوں کے افترا و بہتان ہیں" (مناظرہ صفحہ ۱۹ و ۲۰)

ان خیالات کا عقلی محال

اب اس معترض کے نزدیک حدیث کا کوئی وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے کوئی اقوال و افعال محفوظ رکھے نہ آگے کسی کو پہنچائے نہ تابعین کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تاریخی حالات ان کے اقوال و افعال ان کے فتاویٰ ان کے کارنامے محفوظ رکھیں نہ تبع تابعین کے دل میں ایسا وہم و گمان پیدا ہوا۔ بلکہ پہلی یا دوسری صدی ہجری میں ان باتوں کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے بعض خود غرض لوگوں نے یہ ہزلیات گھڑ لیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ سلام علیہ کے ذمے لگا دیا" شاید اس قول کے قائل سے بڑھ کر نادان دوست اسلام کا کوئی ہی ہوا ہوگا۔ بھلا کون عقلمند اس کو قبول کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سینکڑوں برس تک آپ کے اقوال کو کسی نے محفوظ نہیں رکھا اور پھر دو تین صدیاں بعد اسلامی ممالک کے ہر گوشے میں جو ہزاروں میلوں میں شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی حد اگر ایک طرف ایشیا میں انتہائے مشرق میں پہنچ چکی ہے تو دوسری طرف یورپ میں انتہائے مغرب میں پہنچ چکی ہے۔ جب مختلف ممالک میں مختلف سلطنتیں قائم ہو چکی ہیں۔ جب مشرق کے رہنے والے مغرب کے حالات سے ناآشنا اور مغرب کے رہنے والے مشرق کے حالات سے ناآشنا ہیں۔ ان عظیم الشان وسیع ممالک میں یک لخت کوئی ایسی ہوا چلتی ہے کہ معاً ہر جگہ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو دل سے کچھ اقوال و افعال گھڑ کر اور پھر راویوں کے نام گھڑ کر اور صحابہ کے بھی نام گھڑ کر ہر ایک قول و فعل کے ساتھ ایک سلسلہ روایات قائم کر دیتے ہیں اور اس کو ایسی ترویج دیتے ہیں کہ ایک طرف اگر چین میں یا ایران میں وہ روایت اس سلسلہ اسناد سے مروی ہے تو دوسری طرف ہسپانیہ میں وہی روایت اسی سلسلہ اسناد سے شہرت پا جاتی ہے۔ اور اس زمانہ میں ایک بھی نیک دل انسان ایک بھی خدا ترس

سلطان نہیں رہا جو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کی طرح یہ آواز اٹھائے کہ اے لوگو خدا کا خوف کرو کل تک ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول و فعل تھا نہ کسی صحابی تابعی یا تبع تابعی کا نام ہم جانتے تھے۔ آج تم نے مثلاً ہزاروں کی تعداد میں نام اور واقعات گھڑ کر اور اقوال بنا کر ان کو رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اور ایک نئی نماز بنالی ہے اور زکوٰۃ کے نئے قواعد گھڑ لئے ہیں۔ کیا ایسی سازش پہلے بھی کبھی دنیا پر کسی نے دیکھی یا سنی کہ جس بات کا نام و نشان تک نہ ہو اس پر فوراً ایک اتنی بڑی عمارت تیار کر کے کسی نامعلوم طریق سے ایک مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی اور کل عالم پر محیط قوم کی روزمرہ کی زندگی میں داخل کر دیا جائے اور سب لوگ باوجود یہ جاننے کے کہ کل تک ہم کو ان باتوں کا علم بھی نہ تھا۔ پھر کروڑوں کی تعداد میں بغیر ایک جگہ اکٹھا ہونے کے اتفاق کر لیں کہ نہیں فی الواقع ہمارا اور ہمارے آباواجداد کا اور ان کے آباواجداد کا یہی عملدرآمد چلا آتا ہے۔ اور تعجب یہ کہ مولوی عبداللہ صاحب تو ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے یہ باتیں گھڑی گئیں اور ہم کو دوسری صدی ہجری کی کتنی تصنیفات ملتی ہیں جن میں حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ کی موطا بھی ایک ہے جن میں وہ واقعات لکھے ہوئے موجود ہیں جو ابھی سینکڑوں برس بعد گھڑے جانے تھے۔ اور مولوی صاحب کے فرضی عیسائی یا یہودی کے دماغ میں آنے سے پیشتر وہ حدیثیں ائمہ دین کی لکھی ہوئی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہاں اس خیال کو ایک ہی صورت میں کوئی انسان جس کے سر میں خدا نے وہ گودا رکھا ہے جس سے انسان سمجھ اور فکر کا کام لیتا ہے قبول کر سکتا ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ ساری تاریخ باطل ہے۔ جو کچھ تیرہ سو سال میں لکھا گیا وہ سب جھوٹ۔ اس میں ایک حرف صداقت کا نہیں۔ اور تیرہ سو سال بعد جو خیال مولوی عبداللہ صاحب کے سر میں آگیا وہی سچ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ خیال جس کو مولوی صاحب نے اس قدر زور و شور سے پیش کیا ہے ایسا لچر ہے کہ ایک موٹی سے موٹی عقل کا انسان جس کے اندر ادنیٰ فکر کا مادہ بھی ہو اسے ایک لحظہ کیلئے قبول نہیں کر سکتا۔ اور مولوی صاحب یا انکے ہمخیالوں کے خیالات

خیالات نادان خلوت نشیں
بہم بر زند عاقبت کفر و دیں

کا مصداق ہیں۔ بھلا اگر اتنی بڑی سازش ہو سکتی ہے تو کیا یہ موجودہ قرآن اسی سازش کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ پھر تو یوں کہنا چاہئے کہ نہ کوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے نہ کوئی ان پر قرآن اترا۔ نہ کوئی صحابہ ہوئے نہ کوئی اسلامی سلطنت ہوئی۔ یہ سب کچھ نعوذ باللہ عیار لوگوں نے گھڑ کر باتیں بعد

ہیں مشہور کر دیں ہمیں مسلمانوں کے منہ سے یہ باتیں نکلتی ہوئی دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اور پھر اسی عقلمندی کے برتے پر اور تاریخ کا اس طرح سراسر انکار کر دینے پر سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے اسلام پر سے کل اعتراضات اٹھا دیئے اور سب دنیا فوراً اب مسلمان ہو جائے گی۔ یاد رکھو کہ حدیث کے اس انکار سے جس کی بنیاد مولوی عبداللہ صاحب نے رکھی ہے کل تاریخ اسلامی کا جس کو دنیا کی بہترین تاریخ ہونے کا فخر ہے انکار لازم آتا ہے۔ اور اس کے انکار کے ساتھ کل تاریخ کا ہی انکار ہے۔ پھر تو کوئی بھی گذشتہ واقعہ درست نہیں

پھر میں کہتا ہوں کہ اگر ایک طرف صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا دامن ان افتراؤں کے بنانے سے پاک ہے بلکہ تبع تابعین کا بھی جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب کے "سینکڑوں برس پیچھے" کے اقرار سے ثابت ہے اور دوسری طرف محدثین کرام پر بھی اس افترا کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ مولوی صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ اور دوسری صدی کے اختتام سے پیشتر تبع تابعین کی تصنیفات اب بھی موجود ہیں۔ تو وہ درمیانی زمانہ کونسا ہؤا جب یہودیوں اور عیسائیوں نے قرآن سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے حدیثیں وضع کیں۔ آخر کوئی نیا خیال جب دنیا میں پیش کیا جائے تو اس کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ خود اس کے اندر کوئی معقولیت ہو دوسرے یہ کہ اس کی تائید اور ذرائع سے ہوتی ہو۔ اب جہاں تک معقولیت کا سوال ہے میں حیران ہوں کہ اتنا عظیم الشان تو انقلاب اس خیال کے ذریعہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث سیرت تاریخ کی تمام کتابیں امام مالک اور ابن اسحاق سے لے کر محض مجموعہ اباطیل ہیں۔ اور اول سے آخر تک جھوٹی روایتوں سے پر ہیں۔ اور پھر اس کے لئے اتنا بھی معقولیت کا سہارا تلاش کرنے سے نہیں ملتا کہ آخر یہ حدیثیں جن کو امام مالک سے شروع کر کے بخاری اور مسلم اور دیگر محدثین نے جمع کیا۔ اور یہ سیرت اور تاریخ کے واقعات جن کو ابن اسحاق سے شروع کر کے بڑے بڑے ائمہ نے اپنی کتابوں میں لکھا۔ ان کے بنائے جانے کا زمانہ کونسا ہے۔ آنحضرت کی وفات سے سینکڑوں برس بعد وہ بنتے ہیں۔ یہ تو مولوی صاحب نے فیصلہ کر دیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو سو سال کے اندر اندر وہ ائمہ کی کتابوں میں مدون ہو کر موجود ہو جاتے ہیں اس پر خود تاریخ شاہد ہے۔ اب آخر کوئی سو دو سو سال کا عرصہ ان کے بننے اور ان کی تشہیر اور ترویج اور ان پر کل اسلامی دنیا کا عملدر آمد کرانے کے لئے بھی چاہیئے۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے ایک باطل خیال پیش کر کے بہتوں کو ایک غلط راہ پر تو ڈالا لیکن اتنا بھی غور نہ کیا کہ آخر کوئی زمانہ ان احادیث کی وضع کا بھی تو تجویز کرنا چاہیئے۔ بے سر و پا بات پر دین کی بنیاد رکھنا عقلمندی کا شیوہ نہیں اور نہ صرف یہ خیال معقولیت کو ہی دھکے دیتا ہے بلکہ دوسری ضرورت کے بھی پورا کرنے سے عاری ہے

یعنی اس کی کوئی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اس قدر عظیم الشان مجموعہ افتراؤں کا کبھی تیار ہوا تھا تو کوئی ایک آدھ آواز ہی دنیا کے کسی کنارے سے اٹھتی عرب ایران اور شام سے نہ اٹھتی تو چین، ترکستان یا جزائر سے ہی اٹھتی۔ افریقہ کے وسیع ممالک یا ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت میں ہی کوئی حق پسند پکار اٹھتا کہ یہ حدیثوں کا مجموعہ جو تیار ہوا ہے یا جس کے پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے سراسر افترا ہے۔ ہماری نمازیں یہ نہیں جو ان حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں ہماری زکوٰۃ یہ نہیں جس کا ذکر ان احادیث میں پایا جاتا ہے۔ یہ کام فلاں یہودی یا عیسائی کا ہے جو دین اسلام کو برباد کرنے کے لئے کر رہا ہے مگر یہ کیا ہوا کہ کروڑہا انسانوں میں سے جو ہزارہا میلوں اور بیسیوں ممالک میں پھیلے ہوئے تھے اور الگ الگ زبانیں بولتے تھے۔ ایک شخص کی آواز بھی اس زمانہ میں نہ اٹھی گویا کہ تمام اسلامی دنیا نے سازش کر لی جو ایک ناممکن امر ہے۔ اگر یہ دشمنوں کا کام تھا اور مولوی عبد اللہ صاحب کو یہ اعتراف ہے کہ فی الواقع یہ دشمنان اسلام کا کام تھا۔ تو کسی دوست کی آواز ساری دنیا میں ایک کی ہی سہی اس کے خلاف اٹھنی چاہیئے تھی۔ آخر ایک ڈیڑھ سو یا دو سو سال کا عرصہ اتنی حدیثوں کے بننے اور ان کے مسلمانوں کے اندر مروج ہونے میں لگا ہوگا۔ پھر ان پانچ چھ نسلوں میں کروڑدر کروڑ مسلمانوں میں سے کیوں کسی ایک شخص کی آواز بھی نہ اٹھی۔ کہ یہ سب کچھ دشمنوں کا کام ہے۔ مسلمان متنبہ ہو جائیں یا کیا یہ ساری نسلیں بھی اس عرصہ میں سب کی سب بالاتفاق اسلام کی دشمنی پر کمربستہ ہو گئی تھیں اور اسلام کی خیر خواہی کے اکیلے دم بھرنے والے کے لئے یہ مقدر ہوا کہ وہ تیرہ سو سال بعد پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک تیر چلائے جس سے اگر کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے تو خود اسلام کو ہی اور دشمنان اسلام پر اس کے ذریعہ سے کچھ بھی اتمام حجت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ کونسا کچا یا احمق اسلام کا دشمن ہے جو محض اس لئے کہ مولوی عبد اللہ صاحب نے تیرہ سو سال بعد اگر یہ کہہ دیا ہے کہ تاریخ اسلام تمام کی تمام مجموعہ اباطیل ہے۔ اور اس میں ایک بھی قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں۔ نہ کوئی آپ کا فعل ہے۔ آمنا وصدقنا کہہ اٹھے گا۔ اور اس خیال کو طفلانہ قرار دے کر اس پر ہنسی نہیں کرے گا۔

دوسرا باب

صداقت حدیث پر خارجی شہادت

اس باب میں صداقت حدیث کے دو ایسے بے نظیر ثبوتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو پرانے واقعات تاریخی کو شاذو نادر ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

مکتوب آنحضرت صلعم بنام مقوقس

ان میں سے پہلا ثبوت وہ ہے جو اس رسالہ کے ورق اول سے ملتا ہے جس پر ایک پرانے خط کا فوٹو چھپا ہؤا ہے۔ یہ خط وہ ہے جو حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقوقس شاہ مصر کو لکھا تھا۔ اور ایسے ہی چند اور خطوط دوسرے بادشاہوں کو بھی لکھے گئے تھے۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے۔ یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے ۶ سنہ ہجری کے آخر میں واپس آئے۔ تو اس وقت آپ نے بہت سے گردو نواح کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے دعوتی خطوط لکھے۔ اور یہ خطوط صحابہ رضی اللہ عنہم ان بادشاہوں کے پاس گئے۔ ان خطوط کا ذکر صحیح بخاری اور مسلم میں اور دیگر کتب احادیث میں پایا جاتا ہے۔ مقوقس شاہ مصر کو جو یہ خط لکھا گیا تھا اس کا مفصل ذکر مواہب لدنیہ اور دیگر سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ بلکہ اصل عبارت بھی محفوظ ہے۔ مواہب لدنیہ میں مندرجہ ذیل ذکر اس خط کے بھیجنے کا اسی جگہ موجود ہے جہاں دوسرے بادشاہوں کو خط لکھا جانے کا ذکر ہے۔

وكتب صلی اللہ علیہ وسلم الی المقوقس ملك مصر والاسكندرية واسمه جريج ابن ميناء بسم الله الرحمن الرحيم من محمد عبد الله ورسوله الی المقوقس عظيم القبط سلام علی من اتبع الهدی اما بعد فانی ادعوك بدعاية الاسلام اسلم تسلم يؤتك الله اجرك مرتين فان توليت فعليك اثم القبط يا اهل الكتاب تعالوا الی كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون وبعث به مع حاطب ابن ابی بلتعة فتوجه اليه الی مصر بالاسكندرية ...... فلما جیٔ به اليه ووقف بين يديه ونظر فی الكتاب فضه وقراه وقال لحاطب ما كان لو ان كان نبيا ان يدعو علی فيسلط ۔ فقال له

حاطب وما منع عیسٰی ان یدعو علی من خالفہ ان یسلط علیہ فاستعاد منہ الکلام مرتین ثم سکت فقال لہ حاطب انہ قد کان قبلک رجل یزعم انہ الرب الاعلیٰ فاخذہ اللہ نکال الاخرۃ والاولیٰ فانتقم بہ ثم انتقم منہ فاعتبر بغیرک ولا یعتبر غیرک بک ...... ولعمری ما بشارۃ موسٰی بعیسٰی الا کبشارۃ عیسٰی بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وما دعاءنا ایاک الی القراٰن الا کدعائک اہل التوراۃ الی الانجیل ...... فقال المقوقس انی قد نظرت فی امر ھذا النبی فوجدتہ لا یامر بمزھود فیہ ولا ینھی عن مرغوب فیہ ولم اجدہ بالساحر الضال ولا الکاھن الکاذب ووجدت معہ اٰلۃ النبوۃ ...... واخذ کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجعلہ فی حق من عاج ودفعہ لجاریۃ لہ۔ اس روایت کو ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں بیان کیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم ابن ابی بلتعہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بنام مقوقس لیکر اس کے پاس اسکندریہ میں پہنچے۔ اور نہ صرف خط ہی اس کو پہنچایا بلکہ تبلیغ بھی کی۔ اور جب بادشاہ نے یہ اعتراض کیا کہ اگر آنحضرت صلعم خدا کے نبی ہیں تو وہ کیوں دعا کر کے مجھ پر مسلط نہیں ہو جاتے۔ تو حاطبؓ نے ایسا معقول جواب دیا جس سے بادشاہ شرمندہ ہو گیا۔ یعنی یہ کہ اگر سنت اللہ انبیاء کے متعلق یہی ہوا کرتی ہے کہ وہ بجائے دین حق کی طرف دعوت دینے کے مخالفین پر بددعا کر کے ان کو مغلوب کر لیا کریں تو حضرت عیسٰی نے کیوں ایسا نہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کو مقوقس نے نہایت حفاظت سے ڈبیہ میں بند کیا اور ایک لونڈی کے سپرد کیا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ مہر لگا کر اپنے خزانچی کے سپرد کیا۔

اصل خط کی دریافت

مقوقس کے نام کا خط ۱۸۵۸ء میں مصر کی ایک خانقاہ میں جو عیسائیوں کی ہے بعض فرانسیسی سیاحوں کو مل گیا۔ اور اب اصل خط قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔ اور بڑے بڑے عیسائی محققین نے اسے اصلی قرار دیا ہے۔ منجملہ ان کے ڈاکٹر بیجر ہے اور خود اس کے اصلی ہونے کی یہ کچھ کم شہادت نہیں کہ وہ عیسائی خانقاہ میں عیسائیوں کے ہی ہاتھ لگا۔ اب ہم اس اصلی خط کی عبارت کا اس عبارت سے مقابلہ کرتے ہیں جو احادیث میں موجود ہے تا یہ معلوم ہو کہ احادیث نے اصل واقعات اور اصل الفاظ کو کہاں تک محفوظ رکھا ہے۔ اس غرض کے لئے دو کالموں میں یہ دونوں عبارتیں درج کی جاتی ہیں تا ناظرین آسانی سے مقابلہ کر سکیں۔ دائیں طرف کے کالم میں اصل خط کی عبارت کی نقل ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر بیجر نے اسے پرانی رسم الخط سے نئی رسم الخط میں دکھایا ہے۔ اور بائیں کالم میں حدیث کے الفاظ ہیں جو مواہب لدنیہ کی روایت سے لئے گئے ہیں۔ جس کا حوالہ

الفاظ حدیث اور عکس کا مقابلہ

اوپر بھی دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

من محمد عبد الله ورسوله الى المقوقس
عظيم القبط سلام على من اتبع الهدى
اما بعد فانى ادعوك بدعاية الاسلام اسلم
تسلم يوتك الله أجرك مرتين فان توليت
فعليك اثم القبط يا اهل الكتاب تعالوا الى
كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك
به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون
الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

من محمد عبد الله ورسوله الى المقوقس عظيم القبط
سلام على من اتبع الهدى اما بعد فانى ادعوك
بداعية الاسلام اسلم تسلم يوتك الله اجرك
مرتين فان توليت فعليك اثم القبط يا
اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا
وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به
شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون
الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون



نوٹ: معتبر احادیث میں اس نقش کی مہر بنوائے جانے اور تمام خطوط پر جو بادشاہوں کو بھیجے گئے تھے لگائے جانے کی خبر صحیح موجود ہے۔

اب مذکورہ بالا عبارتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں مطلق کوئی فرق نہیں۔ سوائے لفظ داعیۃ اور دعایۃ کے جن کا مفہوم واحد ہے۔ جہاں تک اصل خط کو دیکھا جاتا ہے داعیۃ پڑھنے والے کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور خط میں اصل لفظ دعایۃ ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اس فرق کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ کوئی فرق نہیں ہے بلکہ درحقیقت روایت اور اصل خط میں ایک حیرت انگیز لفظی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور راویوں نے یہاں تک بھی تصرف نہیں کیا کہ اسی مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کر دیا ہو۔

آنحضرت صلعم کی مہر

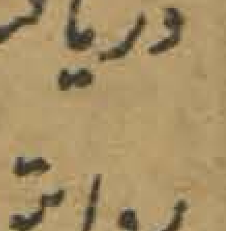
اس اصل خط میں جو دریافت ہوا ہے ایک بات اور نہایت ہی قابل توجہ ہے۔ خط کے آخر پر ایک مہر ہے جس پر نقش محمد رسول اللہ ہے اب اس مہر کی نسبت تمام معتبر احادیث میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور صرف مہر کے متعلق ہی نہیں بلکہ مہر کے نقش اور اس کی دوسری تفصیلات کے متعلق بھی۔ مہر کے متعلق متواتر روایات آئی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مختلف روایتوں سے بیان کی گئی ہے۔

پہلے باب دعاء النبی الی الاسلام میں ہے۔ عن قتادة قال سمعت انسا رضی الله عنه يقول لما اراد النبی صلى الله عليه وسلم ان يكتب الى الروم قيل له انهم لا يقرؤن كتابا الا ان يكون مختوما

فاتخذ خاتمًا من فضة فکانی انظر الیٰ بیاضہ ونقش فیہ محمد رسول اللہ اور دوسری جگہ کتاب اللباس میں یہ حدیث ان الفاظ میں موجود ہے۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد ان یکتب الیٰ رھط او اناس من الاعاجم فقیل لہ انھم لا یقبلون کتابا الا علیہ خاتم فاتخذ النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتمًا من فضة نقشہ محمد رسول اللہ فکانی بوبیص او بصیص الخاتم فی اصبع النبی صلی اللہ علیہ وسلم او فی کفہ۔ اور اسی باب میں پھر حدیث خاتم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے عن ابن عمر رضی اللہ عنھما قال اتخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتما من ورق وکان فی یدہٖ ثم کان بعد فی ید ابی بکر ثم کان بعد فی ید عمر ثم کان بعد فی ید عثمان حتیٰ وقع بعد فی بئر اریس نقشہ محمد رسول اللہ اور پانچویں جگہ پھر یہ حدیث انس بن مالک کی روایت سے ان الفاظ میں موجود ہے لما اراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قیل لہٗ انھم لن یقرؤا کتابک اذا لم یکن مختومًا فاتخذ خاتما من فضة ونقشہ محمد رسول اللہ کانی انظر الیٰ بیاضہ فی یدہٖ۔ ایسا ہی دوسری کتب صحاح میں بھی یہ حدیث موجود ہے یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم کو یا عجم کے بادشاہوں کو خطوط لکھنے کا ارادہ کیا تو صحابہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ لوگ خط کو نہیں پڑھتے۔ سوائے اس کے کہ اس پر مہر کی مہر ہو۔ چنانچہ آپ نے ایک مہر چاندی کی تیار کرائی جس پر محمد رسول اللہ نقش کرایا۔ اور اس سے خطوط پر مہر لگائی۔ پھر یہ مہر آنحضرت صلعم کی زندگی میں آپ کے ہاتھ میں رہی۔ اور آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں اور حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کے ہاتھ میں اور حضرت عمر کی وفات کے بعد حضرت عثمان کے ہاتھ میں اور پھر خلیفہ ثالث سے یہ مہر ایک کنوئیں میں گر پڑی جس کا نام اریس ہے۔ اور پھر نہیں ملی۔ غرضیکہ متواتر روایات سے مہر کا اس موقعہ پر بنوایا جانا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا نقش محمد رسول اللہ تھا۔ اب مقوقس کے اصل خط کے دریافت ہونے نے ان تمام احادیث کی صداقت کو اظہر من الشمس کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ واقعی خطوط پر مہر لگانے کے لئے ہی یہ مہر تیار کی گئی تھی۔ کیونکہ ان ہی خطوط میں سے جن کا ذکر حدیث میں ہے۔ ایک خط پر یہ مہر موجود ہے۔ اور اس کا نقش بھی وہی ہے۔ جو احادیث میں بیان کیا گیا ہے ؎

مہر کا نقش مطابق حدیث اور اس کا عکس سے مقابلہ

مگر احادیث سے اس سے زیادہ تفصیلات اس مہر کے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ حدیث انس کی روایت سے موجود ہے۔ عن انس ان ابابکر رضی اللہ عنہ لما استخلف

كتب له فكان نقش الخاتم ثلثة اسطر محمد سطر و رسول سطر و الله سطر وزادني احمد حدثنا
الانصاری قال حدثني ابي عن ثمامة - - - عن انس قال كان خاتم النبي صلى الله
عليه وسلم في يده وفي يد ابي بكر بعده وفي يد عمر بعد ابي بكر فلما كان عثمان جلس على بئر اريس
قال فاخرج الخاتم فجعل يعبث به فسقط قال فاختلفنا ثلثة ايام مع عثمان ننزح البئر فلم
نجده۔ یعنی حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ یعنی انسؓ ان کے احکام
لکھا کرتے تھے یعنی زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق اور مہر کا نقش تین سطروں میں تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
ایک سطر رسول ایک سطر اور اللہ ایک سطر اور اس روایت پر احمد کی روایت میں اس قدر لفظ اور
زیادہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر آپ کے دست مبارک میں رہی۔ پھر آپ کے بعد حضرت
ابوبکرؓ کے ہاتھ میں پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں پھر ان کے بعد حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں
پھر جب ایک دن حضرت عثمان چاہ اریس پر بیٹھے تھے تو آپ نے انگوٹھی نکالی اور اس کو ہاتھ
میں پھیرنے اور ادھر ادھر کرنے لگے تو وہ گر گئی۔ پھر تین دن تک ہم حضرت عثمانؓ کے ساتھ اس
انگوٹھی کی تلاش میں لگے رہے لیکن انگوٹھی نہ ملی۔ اب اس حدیث سے یہ ایک اور بات معلوم ہوئی
کہ انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ ایک خاص طرز پر لکھا ہوا تھا۔ اور تینوں لفظ الگ الگ سطروں میں تھے
اور یہ انگوٹھی جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے وہی تھی جو بادشاہوں کے نام خطوں
پر مہر لگانے کے لئے تیار کرائی گئی تھی۔ فتح الباری میں اس حدیث کے نیچے بعض شیوخ کے اس قول کو
نقل کیا ہے ان کتابته كانت من اسفل الى فوق يعني ان الجلالة في اعلى الاسطر الثلثة ومحمد
في اسفلها یعنی مہر کی کتابت کی جو تین سطریں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی ترتیب نیچے سے اوپر کو تھی (یعنی
اللہ کا نام سب سے اوپر کی سطر میں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے نیچے کی سطر میں۔ اس قول
کی تضعیف کی گئی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول کسی حدیث پر مبنی تھا۔ جو ملی نہیں۔ مگر اب اصل خط کے
دریافت ہونے نے اس قول کی تصدیق کر کے اس کو صحیح ثابت کر دیا۔ پس اب اگر ہم احادیث کی
روایتوں کی بنا پر مہر کو تجویز کرتے تو اس کا نقش بعینہٖ وہی تجویز کرتے جو اب دریافت ہوا ہے یعنی 
اب اس بے نظیر شہادت پر غور کرو جس سے احادیث اسلامی کی صداقت پہلے سے بھی بڑھ کر
چمک اٹھی ہے۔ ایک پرانی تحریر کے دستیاب ہونے سے اگر احادیث کا اس سے اختلاف ہوتا تو
حدیث پر بڑا بھاری حملہ تھا۔ اور احادیث کی صداقت معرض خطر میں تھی۔ مگر یہی تحریر احادیث کی صداقت
پر ایک عظیم الشان گواہ ہو گئی۔ اور نہ صرف ان تمام احادیث کی صداقت ہی اس سے ثابت ہوئی

جن میں بادشاہوں کے نام خطوط کا لکھا جانا اور مہر کا بنوانا اور ان خطوط پر لگایا جانا مذکور ہے بلکہ اس واقعہ سے عام طور پر احادیث کی صداقت پر مہر لگ گئی کہ کس قدر سچائی سے صحابہؓ نے واقعات کے بیان کرنے میں کام لیا ہے۔

احادیث میں پیشگوئیاں

غرضیکہ مقوقس والا خط ایک بے نظیر شہادت احادیث کی صداقت پر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر اس شہادت کے علاوہ میں احادیث کی صداقت پر ایک اور بے نظیر شہادت اس باب میں پیش کرنی چاہتا ہوں۔ یہ شہادت نہ صرف احادیث کی صداقت پر ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کا منجانب اللہ ہونا ثابت کرتی ہے۔ یہ ہے احادیث میں پیش گوئیوں کا موجود ہونا اگر اسلام کی تاریخ کو ہم تین زمانوں پر تقسیم کریں یعنی ابتدائی زمانہ، درمیانی زمانہ، اور آخری یا موجودہ زمانہ تو ان تینوں میں ہم ان پیشگوئیوں کا ظہور کھلا کھلا پاتے ہیں جو احادیث میں مذکور ہیں۔ اور جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہر زمانہ میں اپنی چمک دکھاتی رہی ہے اور آپ کی برکات کا ہر زمانہ میں جاری رہنا ثابت ہوتا ہے۔ کفار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کے غالب آنے کی پیش گوئیاں کھلے کھلے الفاظ میں قرآن کریم کی مکی سورتوں میں موجود ہیں۔ مگر اس جگہ میرا منشاء صرف ان پیشگوئیوں کے بیان کرنے کا ہے جو احادیث میں ہیں۔ ایسی پیشگوئیاں بکثرت ہیں مگر نمونہ کے طور پر صرف ایک دو ان میں سے میں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً حدیث میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ صحابہ رضؓ شام اور ایران کو فتح کر لیں گے۔

شام و ایران کی فتح کی پیش گوئی

یہ پیشگوئی اس وقت کی ہے جب جنگ احزاب کے وقت خندق کھودی جا رہی تھی۔ احمد نسائی، بیہقی، طبرانی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ اصل حدیث یہ ہے جس کے اول راوی براء بن عازب صحابی ہیں۔ قال لما کان حین امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحفر الخندق عرضت لنا فی بعض الخندق صخرۃ لا تاخذ فیھا المعاول فاشتکینا ذلک الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجاء فاخذ المعول فقال بسم اللہ فضرب ضربۃ فکسر ثلثھا وقال اللہ اکبر اعطیت مفاتیح الشام واللہ انی لابصر قصورھا الحمر الساعۃ ثم ضرب الثانیۃ فقطع الثلث الآخر فقال اللہ اکبر اعطیت مفاتیح فارس واللہ انی لابصر قصر المدائن ابیض ثم ضرب الثالثۃ فقال بسم اللہ فقطع بقیۃ الحجر فقال اللہ اکبر اعطیت مفاتیح الیمن واللہ انی لابصر ابواب صنعاء من مکانی ھذا الساعۃ ...... اور بعض روایتوں میں آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں فکبر المسلمون واستبشروا۔ یعنی خندق میں ایک پتھر کو توڑتے وقت آپ نے یہ فرمایا کہ مجھے شام کی کنجیاں دی

گئی ہیں۔ اور میں اس کے سرخ محلوں کو اس وقت دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر فرمایا کہ مجھے فارس کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور میں اس جگہ سے اس کے سفید محلوں کو دیکھ رہا ہوں اور ایسا ہی یمن کے متعلق فرمایا کہ اس کی کنجیاں مجھ کو دی گئی ہیں۔ اور یہ اس حال میں فرمایا جب آپ ایک پتھر کو توڑ رہے تھے۔ آپ نے اس پتھر کو تین ضربوں میں توڑا اور ہر ایک ضرب کے بعد ایک پیشگوئی کی۔ گویا اس پتھر کا توڑنا بطور ایک فال کے تھا کہ یہ سلطنتیں آپ کے صحابہ کے آگے اسی طرح ٹوٹ جائیں گی۔

احادیث کی وہ پیشگوئیاں جو کتب حدیث کی اشاعت کے بعد پوری ہوئیں

لیکن علاوہ اس کے ایک اور ثبوت بھی یہ احادیث اپنی صداقت کا رکھتی ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایسی ہی پیشگوئیاں درمیانی زمانہ کے متعلق بھی پائی جاتی ہیں۔ اور وہ قطعی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہونے کا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اس طرح پر کہ حدیث کی اکثر کتابیں جن میں پیشگوئیاں درج ہیں۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اکٹھی ہو کر دنیا میں شائع ہو چکی تھیں اور درسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور لاکھوں انسان ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ اب انہیں کتابوں میں ہم وہ حدیثیں پاتے ہیں جن میں ایسی پیشگوئیاں مذکور ہیں جو صدہا سال بعد پوری ہوئیں۔ اور بسبب اس کے کہ یہ کثرت سے لوگوں کے درمیان شائع ہو چکی تھیں۔ ان کے پورا ہونے پر اہل علم نے ان واقعات کو لکھا اور خدا کا کلام پورا ہونے پر خوشی ظاہر کی۔ اس طرح پر یہ احادیث نہ صرف اپنی صداقت کا ثبوت ہی اپنے اندر رکھتی ہیں بلکہ ان دوسری احادیث کی صداقت پر بھی شاہد ہیں جن میں وہ پیشگوئیاں موجود ہیں جو جمع احادیث سے پہلے زمانہ میں پوری ہو چکی تھیں۔

فتح قسطنطنیہ کی پیشگوئی

سنن ابوداؤد اور صحاح ستہ کی بعض دوسری کتابوں میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں کھلے کھلے لفظوں میں فتح قسطنطنیہ کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔ گویا یہ بیان کیا گیا ہے کہ قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آنے کے بعد پھر نکل جائیگا۔ اب جس وقت ان احادیث کو ان کتابوں میں لکھا گیا۔ اس وقت قسطنطنیہ عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اور مسلمانوں کی دو یا اڑھائی سو سال کی فتوحات کے باوجود قسطنطنیہ ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اور نہ کوئی قرائن ایسے موجود تھے۔ کہ مسلمان اس شہر کو فتح کرینگے مگر محدثین کو کبھی ان باتوں کا خیال نہ تھا بلکہ وہ صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ حدیث کی صحت ثابت ہے یا نہیں۔ جن احادیث کی صحت ان کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی وہ انہیں قبول کر لیتے تھے خواہ ان میں ایسی پیشگوئیاں ہوں جو پوری ہو چکی ہوں اور خواہ ایسی ہوں جو ابھی آئندہ زمانہ کے متعلق ہوں۔ اب یہ پیشگوئیاں قسطنطنیہ کے متعلق ابتدا سے مسلمانوں کے درمیان شہرت یافتہ تھیں اور پھر دوسری یا تیسری صدی ہجری میں کتابوں میں لکھی جا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئیں چنانچہ ان

کے لکھا جانے کے قریباً پانچ سو سال بعد ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ایسے زمانہ میں جبکہ پیشگوئی کے شائع ہونے پر آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا[۱]۔ یہ کس قدر صریح ثبوت ہے۔ نہ صرف اس امر کا کہ یہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلی ہوئی ہیں۔ بلکہ آنحضرت صلعم کی صداقت پر بھی یہ پیشگوئیاں بین گواہ ہیں۔ ایسا ہی انہی کتب یعنی ابو داؤد وغیرہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں یہ پیشگوئیاں ہیں کہ مسلمان ترکوں کے ہاتھ سے سخت ہزیمت اٹھائیں گے اور قتل کئے جائیں گے۔ یہ پیشگوئی بھی صدہا سال بعد پوری ہوئی۔ جب ترکوں نے بغداد کو تباہ کیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنی طرف سے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ساتویں صدی ہجری کا ہے۔ جب ان پیشگوئیوں کو کتابوں میں لکھے ہوئے چار سو سال کے قریب گذر چکے تھے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان احادیث کی شرح لکھی ہے۔ انہوں نے ان تمام واقعات کو جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرنیوالے ہیں۔ پورے بسط سے ان احادیث کے نیچے لکھا ہے۔ اور ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعجاز کے رنگ میں پیش کیا ہے ایسا ہی عیسائیوں کا تھوڑے عرصہ کیلئے مسلمانوں پر غالب آکر بیت المقدس پر قبضہ کر لینا اور مسلمانوں کا پھر دوبارہ ان سے بیت المقدس لے لینا۔ ان سب واقعات کے متعلق ان ہی کتابوں میں پیشگوئیاں لکھی گئیں۔ اور آخر مدت بعد پوری ہو کر لاکھوں انسانوں کے ازدیاد ایمان کا موجب ہوئیں۔

خروج نار کی پیشگوئی

اسی زمانہ کے متعلق ایک اور مثال میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ صحیح بخاری میں جو بہرحال امام بخاری علیہ الرحمۃ کی وفات سے (جو ۲۵۶ھ ہجری میں واقع ہوئی) پہلے شائع ہو چکی تھی۔ باب خروج النار کے نیچے یہ حدیث ابوہریرہ کی روایت سے درج ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقوم الساعۃ حتی تخرج نار من ارض الحجاز تضیئ اعناق الابل ببصری یعنی ضروری ہے کہ قبل از قیامت ارض حجاز سے ایک آگ نکلے جو بصری میں اعناق الابل یعنی ٹیلوں اور پہاڑیوں کو روشن کر دے۔ یہی حدیث صحیح مسلم میں بھی درج ہے۔ اور اس میں یہ کھلی کھلی پیشگوئی ہے کہ ارض حجاز سے کوئی عظیم الشان آگ نکلے گی جس کی روشنی بصرے کی پہاڑیوں تک پہنچیگی۔ یہ پیشگوئی تیسری جمادی الآخر ۶۵۴ھ ہجری کو پوری ہوئی۔ چنانچہ فتح الباری میں اس آگ کے نکلنے کا حسب ذیل ذکر لکھا ہے:۔

---

[۱] پیشگوئی کا دوسرا حصہ اس زمانہ میں پورا ہوا ہے۔

قال القرطبی فی التذکرۃ قد خرجت نار بالحجاز بالمدینۃ وکان بدوھا زلزلۃ عظیمۃ فی لیلۃ الاربعاء بعد العتمۃ الثالث من جمادی الاخرۃ سنۃ اربع وخمسین وستمائۃ واستمرت الی ضحی النھار یوم الجمعۃ فسکنت وظھرت النار بقریظۃ بطرف الحرۃ تری فی صورۃ البلد العظیم علیھا سور محیط علیہ شراریف وابراج وماذن وتری رجال یقودونھا لا تمر علی جبل الا دکتہ و اذابتہ ویخرج من مجموع ذالک مثل النھر احمر وازرق لہ دوی کدوی الرعد یاخذ الصخور بین یدیہ وینتھی الی محط الرکب العراقی واجتمع من ذالک ردم صار کالجبل العظیم فانتھت النار الی قرب المدینۃ ومع ذالک فکان یاتی المدینۃ نسیم بارد وشوھد لھذہ النار غلیان کغلیان البحر وقال لی بعض اصحابنا رایتھا صاعدۃ فی الھواء من نحو خمسۃ ایام وسمعت ان النار رؤیت من مکۃ ومن جبال بصری وقال النووی تواتر العلم بخروج ھذہ النار عند جمیع اھل الشام - گویا اس آگ کا نکلنا ایک ایسا مشہور واقعہ تھا کہ سب اہل علم نے اس پیشگوئی کے پورا ہونے کو محسوس کیا جو صحیح بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہے۔ مطلب عربی عبارت مذکورہ بالا کا یہ ہے۔ کہ قرطبی نے تذکرہ میں اس بات کو بیان کیا ہے۔ کہ حجاز میں ایک آگ نکلی۔ اور اس سے پہلے ایک بڑا بھاری زلزلہ آیا۔ اور یہ واقعہ تیسری جمادی الثانی ۶۵۴؁ہجری بعد عشا کا ہے۔ اور یہ آگ برابر جلتی رہی۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن چاشت کے وقت آ کر ٹھہری۔ اور دور سے یہ آگ ایک بڑے شہر کی طرح نظر آتی تھی۔ جس کے گرد فصیلیں ہوں اور ان پر برج وغیرہ ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ آدمی اس آگ کو جلا رہے ہیں۔ جس پہاڑ پر یہ آگ گذرتی تھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی۔ اور پگھلا دیتی تھی۔ اور اس سے ایک نہر نکلتی تھی سرخ اور نیلگوں رنگ کی۔ آواز اس کی ایسی تھی جیسے بادل کے گرجنے کی آواز۔ اور پتھروں کو ساتھ بہائے لئے جاتی تھی۔ اور اس جگہ پر آ کر ٹھہری جو قافلہ عراق کے اُترنے کی جگہ ہے۔ اور اس سے ایک روک ایک بڑے پہاڑ کی مانند بن گئی۔ اور آگ مدینہ کے قرب وجوار تک پہنچ گئی۔ مگر باوجود اس کے مدینہ میں ٹھنڈی ہوا آتی رہی۔ اور اس آگ میں ایک جوش اور طوفان نظر آتا تھا۔ جیسا سمندر میں طوفان آتا ہے۔ اور دیکھنے والوں نے بیان کیا کہ قریبًا پانچ دن یہ آگ ہوا میں چڑھی ہوئی دیکھی گئی۔ اور یہ بھی میں نے سنا ہے کہ یہ آگ مکہ اور بصرے کے پہاڑوں سے نظر آتی تھی۔ اور نووی کہتا ہے کہ کل اہل شام کے نزدیک اس آگ کے علم کا تواتر پایا جاتا ہے ؛

اب ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر غور کرو۔ ان واقعات کو ان پیشگوئیوں پر آج ہی نہیں لگایا

جاتا بلکہ جس وقت یہ واقعات ظاہر ہوئے۔ اس وقت اہل علم نے ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر خوشی ظاہر کی۔ کیونکہ یہ پیش گوئیاں کوئی پوشیدہ امر نہ تھیں۔ بلکہ لاکھوں انسانوں میں مشہور اور سینکڑوں کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ اور اسی لئے نار حجاز کے نکلنے اور دوسری بعض پیشگوئیوں کو ان شارحین حدیث نے جن کے زمانے سے پہلے یہ واقعات ہو چکے تھے مفصل طور پر اپنی کتابوں میں بیان کیا۔ اس سے بڑھ کر صداقت احادیث کا اور کیا ثبوت طلب کیا جا سکتا ہے ؂

ترکوں سے مسلمانوں پر تباہی آنیکی پیشگوئی

اب ان پیشگوئیوں کی حقیقت پر غور کرو۔ ترکوں کے ہاتھ سے جو مسلمانوں پر تباہی آنے والی تھی۔ اس کی کیسی صریح الفاظ میں مخبر صادق علیہ السلام نے خبر دی ہے۔ نہ صرف ترک کا نام لیکر ہی سمجھایا۔ بلکہ یوں بھی بیان فرمایا۔ قال لا تقوم الساعة حتیٰ تقاتلوا قوماً نعالهم الشعر وحتیٰ تقاتلوا الترك صغار الاعین حمر الوجوه ذلف الانوف كان وجوههم المجان المطرقة۔ صحابہ رض کے درمیان یہ پیشگوئی بہت شہرت پا چکی تھی۔ کیونکہ ان کو یہ خبر دی گئی تھی کہ اتركوا الترك ما تركوكم جب تک ترک تم کو کچھ نہ کہیں تم بھی انہیں مت چھیڑو کیونکہ مسلمانوں پر ترکوں کے ہاتھ سے تباہی آنے والی ہے۔ چنانچہ حضرت معاویہ کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ معاویہ بن خدیج کہتا ہے کہ میں معاویہ رض کے پاس تھا۔ تو ان کے پاس ان کے ایک عامل کا خط آیا کہ ترکوں سے اس کا مقابلہ ہوا اور اس نے ترکوں کو بھگا دیا۔ اس پر معاویہ رض بہت غضبناک ہوئے اور اس عامل کو لکھا کہ جب تک میں تم کو نہ لکھوں ان سے جنگ مت کرو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ترک عربوں کو نکال دیں گے۔ یہاں تک کہ ان کو شیخ (گھاس) کے اُگنے کی جگہ تک پہنچا دیں گے۔ یعنی شہروں سے نکال کر جنگلوں میں داخل کر دیں گے۔ جس سے اشارہ عظیم الشان تباہی کی طرف ہے۔ اور معاویہ رض نے لکھا کہ اسی وجہ سے میں ترکوں کے ساتھ جنگ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ اور آخر جب مسلمانوں نے مخبر صادق کے حکم اتركوا الترك کی خلاف ورزی کی۔ اور خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کے ایلچیوں کو قتل کر ڈالا۔ تو پھر وہ تباہی مسلمانوں پر آئی جس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی طبرانی نے یہ حدیث بیان کی ہے ان بنی قنطورا اول من سلب امتی ملكهم۔ یعنی ترک ہی اول وہ لوگ ہوں گے جو میری اُمت سے ملک چھین لیں گے۔ غرضکہ صحابہ رض کے اندر یہ ایک نہایت ہی شہرت یافتہ امر تھا کہ ترکوں کے ہاتھ سے مسلمانوں پر خطرناک تباہی آئے گی۔ اور یہ پیشگوئیاں صحاح ستہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں اور اُن کے لکھا جانے کے صدہا سال بعد یہ پیشگوئیاں نہایت صفائی

اور وضاحت سے پوری ہوئیں۔ الغرض یہ پیشگوئیاں جو اسلام کے درمیانی زمانہ میں پوری ہوئیں مدتوں پہلے احادیث کی کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ اور اس طرح پر یہ احادیث کی صداقت پر ایک عظیم الشان گواہ ہیں۔

آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں

مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں اسلام کے ابتدائی یا درمیانی زمانوں تک ہی محدود نہیں رہیں۔ بلکہ اس آخری زمانہ میں بھی وہ اسی صفائی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے کی شہادت ادا کر رہی ہیں۔ کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ اس زمانہ کا نقشہ احادیث میں نہایت صفائی سے کھینچا ہوا موجود ہے۔ دین صلیبی کا اطراف عالم میں پھیل جانا اور اس کا دنیا پر غالب ہو جانا۔ اس کے حامیوں کا مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے ہر قسم کے سامان دنیوی کا پیش کرنا۔ اس کے ساتھ عالم میں عیش و عشرت کا ترقی کر جانا۔ اور سیم و زر کی افراط۔ مسلمانوں کا قرآن کو چھوڑ دینا۔ اسلام کا پھر حالت غربت کی طرف عود کر آنا۔ مسلمانوں پر اس قدر فتن کا ہجوم کرنا کہ وہ ایک طرف سے نکلیں تو دوسری طرف مبتلا ہو جائیں۔ دنیا میں دو قوموں کا پیدا ہو جانا جن کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت کسی کو نہ ہوگی۔ اور ان کا عالم پر محیط ہو جانا۔ آخر عیسائیت کا خود بخود کمزور ہو کر اس کے عقائد کی غلطی کا دنیا پر ظاہر ہو جانا اور اس طرح پگھل جانا جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے اور دین اسلام کا براہین کے ساتھ غالب آ کر آفتاب صداقت خیر البشر کا مغرب سے طلوع کرنا وغیرہ یہ تمام امور احادیث میں بالصراحت موجود ہیں۔ مگر یہ مضمون اس قدر بسط کو چاہتا ہے کہ اس کے لئے علیحدہ رسالہ کی ضرورت ہے اس لئے میں اسے کسی دوسرے وقت پر چھوڑ کر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

تیسرا باب

ضرورت حدیث

ہم قرآن میں ہم حدیث کے محتاج ہیں

سب سے پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ آیا فی الواقع ہمیں حدیث کی کچھ ضرورت ہے؟ جن لوگوں نے اس زمانہ میں انکار حدیث کیا ہے اس کی بڑی وجہ وہ یہی بتاتے ہیں کہ ہمیں حدیث کی کچھ ضرورت نہیں اور نہ قرآن کریم حدیث کا محتاج ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی طرف سے جب سوال ہوتا ہے تو اسی رنگ میں ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کسی اور چیز کا محتاج ہے؟ اس سوال میں درحقیقت ایک مغالطہ ہے۔ اور بعض لوگ گھبرا اُٹھتے ہیں کہ آیا فی الواقع قرآن شریف کوئی ایسی ناقص چیز ہو کہ وہ کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم قرآن کریم کو ایک کامل کتاب مانتے ہیں کسی دوسرے کا محتاج اسے قرار دینا اسے ناقص فرض کرنا ہے۔ مغالطہ اس میں یہ ہے کہ فی الواقع قرآن شریف تو کامل ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ مگر ہم اس کے سمجھنے کے لئے بہت سی چیزوں کے محتاج ہیں۔ ہم اس زبان کے محتاج ہیں جس میں قرآن شریف نازل ہوا۔ کہ اس کو جانیں۔ ہم لغت کے محتاج ہیں۔ گو وہ لغت کی کتابیں قرآن شریف کے بعد ہی بنی ہوں۔ ہم صرف و نحو کے محتاج ہیں۔ کیونکہ صرف و نحو نے زبان کے قواعد کو منضبط کر دیا۔ اگر ان چیزوں کو ہم نہیں جانتے تو قرآن شریف کو ہم نہیں جان سکتے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کو سمجھنے کے لئے ہم حدیث کے محتاج ہیں اور یہ ایک موٹی بات ہے کہ جس طرح اپنے اپنے زمانہ میں مفسرین نے اور اہل علم نے لوگوں کو سمجھانے کیلئے قرآن کریم کے متعلق بہت کچھ لکھا حتیٰ کہ اس زمانہ میں مولوی عبداللہ صاحب کو ایک ضخیم ترجمہ، تفسیر، نماز زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق کتابیں لکھنی پڑیں تاکہ قرآن کریم کی اصل منشار سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ اسی طرح اور اس سے بہت بڑھ کر نزول قرآن کریم کے وقت یہ ضرورت تھی کہ اس قلب مقدس کا مالک جس پر یہ کلام نازل ہوا اور جو دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر اس کے اصل منشار کو سمجھتا تھا۔ اس منشار سے دوسروں کو آگاہ کرے۔ اس نے اپنے قول سے اور اپنے فعل سے اس اصل منشا کو لوگوں پر ظاہر فرمایا اور اسی کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ اور جس طرح وہ لوگ قرآن کریم کے اصل منشا

کو سمجھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے محتاج تھے اور اس اصل منشاء کو مہبط وحی صلعم سے بڑھ کر کوئی سمجھنے والا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہم بھی اس اصل منشاء کو سمجھنے کے لئے حدیث کے محتاج ہیں ؁

خدا قوانین کا محتاج نہیں مگر انسان ہے

میں اس بات کو دوہرانا چاہتا ہوں۔ انسان دنیا میں بے شمار چیزوں کا محتاج ہے۔ قرآن شریف کے کامل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اب انسانوں کو اور کسی شے کی احتیاج نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں انسان کو ملتی ہیں اور وہ جس طرح ملتی ہیں۔ وہ سب امور ایک قانون کے ماتحت ہیں۔ اور اسی قانون کے مطابق وہ چیزیں ملتی ہیں۔ خدا ان قوانین کا محتاج نہیں۔ مگر انسان کو ان سب کا محتاج کہیں گے۔ ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ملتی ہے وہ جبرائیل لاتے ہیں پس پہلی شاخ تو اس قانون کی یہی ہے۔ پھر حضرت جبرائیل اسے ایک قلب صافی پر نازل کرتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چن لیتا ہے۔ یہ دوسری شاخ اس قانون کی ہوئی اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے براہ راست انسانوں کو اپنا کلام پہنچاتا یا رسول اللہ کو ہی بغیر کسی واسطہ کے اپنا کلام پہنچاتا مگر یہ اس کا قانون ہے اب ہم یوں نہیں کہیں گے کہ نعوذ باللہ من ذالک۔ خدا بھی جبرائیل کا محتاج ہے۔ یا محمد رسول اللہ کا محتاج ہے۔ نہیں یہ ایک ضروری واسطہ ہے۔ جو قانون الٰہی کے ماتحت پایا جاتا ہے۔ پھر دوسرا مرحلہ انسانوں تک اس ہدایت کے پہنچنے کا یہ ہے کہ وہ رسول اس کلام کو جو اس پر نازل ہوتا ہے ان پر پڑھ دیتا ہے۔ مگر صرف پڑھ دینا بھی کافی نہیں بلکہ ان کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی اس کے اصل منشاء سے ان کو آگاہ کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ پس قانون الٰہی نے یہ ضروری ٹھہرایا کہ ہدایت الٰہی بندوں تک ان سب واسطوں سے پہنچے یعنی اول جبرائیل رسول بشر کو پہنچائے پھر رسول بشر دوسرے انسانوں کو پہنچائے۔ اور نہ صرف پہنچائے۔ بلکہ اس کی تعلیم دے یعنی اس کے اصل منشاء سے ان کو آگاہ کرے۔ یہ ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان کے باہم تعلق کے بغیر وہ زنجیر نہیں بنتی گو اپنی جگہ ہر ایک کڑی اس زنجیر کی اعلیٰ درجہ کی مکمل ہو۔ ہم انسان اس زنجیر کی ساری کڑیوں کے یکساں محتاج ہیں۔ ان میں سے ایک کڑی بھی نہ ہو تو ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ قرآن شریف پر عامل ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اس کا علم حاصل کریں۔ اس علم کے حاصل کرنے میں ہم تو لغت و صرف و نحو کے بھی محتاج ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم کے محتاج کیونکر نہ ہوں۔ مولوی عبد اللہ کے پیرو اگر اس بات کے محتاج ہیں کہ مولوی عبد اللہ نے اس قرآن کو کس طرح سمجھا تو ہمیں بھی یہ فخر حاصل ہے کہ ہم حضرت محمد مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک اور سراپا نور فہم کے محتاج ہیں۔ افسوس اس شخص پر جو قرآن شریف کے سمجھنے کیلئے اپنے آپ کو لغت اور صرف ونحو کا محتاج تو سمجھتا ہے۔ مگر اس پاک سرچشمہ کی احتیاج سے اپنی زبان تشنہ کو آزاد کرکے پیاس مرنا چاہتا ہے۔ جہاں سے وہ کلام پھوٹ کر نکلا۔ یہ احتیاج سے آزادی نہیں۔ یہ ہلاکت اور بربادی ہے۔

قرآن کے مفصل ہونے کے باوجود مولوی عبداللہ کی تشریحات

مگر کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی کتاب کے منشاء کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں کیونکہ قرآن شریف تفصیل کل شیئ ہے (یوسف - ۱۱۱) یعنی ہر چیز کی تفصیل۔ اور فرمایا کل شیئ فصلناہ تفصیلا (بنی اسرائیل ۱۲) ہر ایک چیز کو ہم نے اس میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور فرمایا یہ کتاب مفصل ہے (الانعام - ۱۱۵) یعنی اس میں ہر ایک چیز کھول کر بیان کر دی گئی۔ اور اس کو تبیاناً لکل شیئ (النحل - ۸۹) کہا گیا ہے یعنی ہر ایک چیز کو بیان کر دینے والی۔ پس کسی قسم کی تشریح یا تفصیل کی حاجت ہی اس نے باقی نہیں چھوڑی۔ ساری تشریحات اور تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں۔ ایک شخص حیرت میں رہ جاتا ہے جب ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب کے ان دلائل کو پڑھتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک حکم اقیموا الصلوٰۃ کی تشریح کے لئے چار سو سے زائد صفحوں کی ایک کتاب میں سے اسے گذرنا پڑتا ہے جس کا نام ہے برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن۔ ایک طرف مولوی صاحب کے اس قول کو دیکھو کہ "قرآن مجید میں دین اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر بیان ہوگئی ہے۔ تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عملدرآمد کرنا سراسر کفر شرک ظلم فسق ہے" اور دوسری طرف ایک نماز کی تشریح کے لئے چار سو صفحات کو دیکھو۔ حالانکہ حدیث کی کسی کتاب میں چار سو صفحات کی نماز کی تشریح کے لئے ضرورت نہیں پڑی۔ جب حدیث کی عدم احتیاج ثابت کرنی ہو تو قرآن میں ہر چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر موجود ہو جاتی ہے۔ اور جب نماز کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے راہ بتانی ہو تو چار سو صفحات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تعجب ہے کہ "دین اسلام میں حدیث پر عملدرآمد کرنا تو سراسر کفر شرک ظلم فسق ہے" مگر مولوی عبداللہ صاحب کے چار سو صفحات کی تشریح پر عملدرآمد کرنا اور اسے پڑھنا موجب ہدایت ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فہم قرآن ہمارے سامنے آئے تو ہم اس سے بیزار ہوں کیونکہ قرآن مفصل و مشرح ہے۔ مگر مولوی عبداللہ صاحب کا فہم و تشریح قرآن عین ہدایت ہے! نعوذ باللہ من ذلک۔ کہا جائے گا کہ مولوی عبداللہ صاحب قرآن شریف سے ہی استدلال کرتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ استدلال کے کیا معنی جب ہر ایک چیز قرآن شریف

میں مفصل و مشرح موجود ہے۔ اور پھر یہ استدلال بھی عجیب ہیں۔ بطور مشتے از نمونہ خروارے دو تین مقام پیش کرتا ہوں تا کہ مولوی عبداللہ صاحب کے اس دعویٰ پر کچھ روشنی پڑے کہ قرآن کریم میں ہر ایک چیز دین اسلام کی من کل الوجوہ مفصل و مشرح ہے۔

قرآن میں بین السجدتین بیٹھنے کا علم

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا چاہیئے۔ یہ بھی قرآن شریف میں مفصل و مشرح موجود ہے مگر اس تفصیل کو دیکھئے۔

"دو سجدے ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ پہلے سے سر نہ اٹھایا جائے۔ آیت سجدتین میں دوسرا یخرون الخ ظاہر کرتا ہے کہ انبیاء جب دوسرے سجدے میں گرتے تھے تو گرنے سے پہلے سجدے میں نہیں ہوتے تھے...... پس پہلے سجدہ سے سر اٹھائے بغیر دوسرا سجدہ نہیں ہو سکتا۔ سر اٹھا کر چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ زمین سے تھوڑا سا سر اونچا کر کے دوسرے سجدہ میں گر جائے جیسا کہ اکثر جلد باز نمازی کرتے ہیں۔ دوئم یہ کہ لیٹ جائے۔ سوم بیٹھ جائے۔ چہارم کھڑا ہو جائے۔ اوّل و دوم اس لئے جائز نہیں کہ یہ دونوں خرّ میں داخل ہیں خرّ کے معنی ہیں جھکنا۔ گرنا۔ پہلی جھکنے میں شامل ہے اور دوسری گرنے میں۔ پس ان دونوں صورتوں میں انسان حالت خرّ میں ہی ہوتا ہے اور خرّ سے خرّ جائز نہیں بلکہ عدم خرّ سے یعنی ایسی حالت سے جس پر خرّ کا اطلاق نہ ہو سکے اور جو کامل طور پر اس کا ضد و نقیض ہو۔ تیسری اور چوتھی صورت میں خرّ نہیں اور وہ اس کے بالکل ضد و نقیض ہیں۔ اب یہ امر قابل غور ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی صورت فرض ہے۔ جاننا چاہیئے کہ تیسری صورت یعنی بیٹھنا فرض ہے بدلیل ذیل اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے "آت ذاالقربیٰ حقہ" کہ نزدیکیوں کو ان کا حق دو۔ بیٹھنا سجدہ کا قریبی و نزدیکی ہے۔ اور قیام اس سے دور و بعید ہے۔ سجدے میں جس قدر اندام زمین کے قریب ہوتے ہیں۔ بیٹھنے میں اس سے کم اور کھڑا ہونے میں اس سے بھی کم اس وجہ سے بھی بیٹھنا سجدہ کے نزدیک تر ہے بہ نسبت قیام کے ...... پس قعود ہی اس بات کا مستحق ہے کہ وہ سجدہ کے متصل ہو قیام نہیں" (برہان الفرقان صفحہ ۲۶۷ و ۲۶۸) میں نے بہت سی عبارتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور بطور نمونہ یہ دو سجدوں میں بیٹھنے کا حکم جو بزعم مولوی صاحب قرآن شریف میں مفصل و مشرح موجود ہے۔ اس کا ایک جملہ بیان کر دیا ہے۔ قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے یہ قرآن شریف کی کسی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہوگا۔ کیونکہ جو چیز مفصل و مشرح موجود ہو اس کی مزید تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں ہونی چاہیئے جیسا کہ حدیث کے رد کرنے کیلئے مولوی صاحب ضروری سمجھتے ہیں نہیں یہ سارے قیاسات مولوی صاحب کے از خود تراشیدہ ہیں۔ یہ صحیح ہوں یا غلط اس سے اس وقت بحث نہیں

قرآن میں تکبیر کے وقت کان پکڑنے کا حکم

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۲۸۲ سے مضمون شروع ہوتا ہے۔

"تکبیر کہتے وقت کان پکڑنے کے بیان میں"

پورے دس صفحوں کے بعد دلیل آتی ہے قل ارایتم ان اخذ اللہ سمعکم و ابصارکم و ختم علیٰ قلوبکم من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بہ انظر کیف نصرف الاٰیات ثم ھم یصدفون۔ شاید کسی کو تعجب ہو کہ اس میں کان پکڑنے کا حکم کہاں مفصل و مشرح موجود ہے تو اس کی وجہ مولوی صاحب یہ بتائیں گے کہ تم لوگ قرآن کو غور سے نہیں پڑھتے۔ مولوی صاحب نے چونکہ غور سے پڑھا ہے اسلئے ان کے معنی قبول کرنے ہوں گے۔ وہ معنی یوں ہیں۔

(اے پیغمبر جو لوگ کانوں آنکھوں اور دل کو نماز میں ذلیل و حقیر نہیں کرتے یعنی کانوں کو نہیں پکڑتے آنکھوں کو ادھر اُدھر دیکھنے سے نہیں روکتے اور دل میں خوف ربی نہیں رکھتے ان سے) کہدو کہ سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ اگر اللہ تمہارے کان پکڑے (بہرے کر دے) اور تمہاری آنکھیں (مٹا دے) اور تمہارے دلوں پر بندش کر دے تو سوائے خدا کے تمہارا کوئی بزرگ ہے جو تم کو یہ چیزیں لا دے (پس جبکہ کوئی ایسا نہیں تو بہتر ہے تم خود ہی نماز میں اپنے کان پکڑا کرو۔ آنکھوں کو ادھر اُدھر دیکھنے سے روکا کرو۔ دل میں خدا کا خوف رکھو تا کہ خدا تمہارے کان نہ پکڑے۔ آنکھیں نہ مٹائے دلوں پر بندش نہ کر دے) دیکھ (اے رسول) کیونکر ہم طرح طرح پر تضرع کی آیات بیان کرتے ہیں۔ اس پر بھی یہ لوگ (قرآنی تضرع سے) منہ پھیرے چلے جاتے ہیں۔" صفحہ ۲۹۲

چونکہ مولوی صاحب کا ایمان یہ ہے کہ قرآن شریف مفصل و مشرح ہے اور اس کی کسی اور تشریح کی حاجت ہی نہیں اس لئے دیکھئے کس قدر احتیاط ترجمہ میں مولوی صاحب نے کی ہے کہ اپنی طرف سے سطروں کی سطریں بڑھا دی ہیں۔ اور یہ نماز میں کان پکڑنے کی دلیل ہے۔ اگلے زمانہ میں جو مُلّا لڑکوں کے کان پکڑوایا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی آیت سے دلیل لیتے ہوں۔ اور اب یہ جھگڑا طے کرنا باقی رہے گا کہ کیوں نماز میں اس طرح کان نہ پکڑے جائیں جس طرح مکتبوں میں طالبعلموں کے پکڑوائے جاتے تھے۔ کیونکہ پوری ذلت تو اسی طرح ہوتی ہے۔ اگر یہ قرآن شریف ایسی مقدس کتاب کے ساتھ مسخری نہیں تو اور کیا ہے کہ چونکہ خدا فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمہاری شنوائی لیجائے اس لئے یہاں یہ شرح و مفصل حکم موجود ہے کہ اگر تم نماز پڑھتے وقت کان نہ پکڑو گے تو خدا تمہارے کان پکڑے گا اور پھر یہاں تو بصارت کے لیجانے کا بھی ذکر ہے جس کا ترجمہ مولوی صاحب کے نزدیک یہ ہونا چاہیے کہ نماز پڑھتے وقت اپنی آنکھوں میں انگلیاں مارا کرو۔

مگر یہ کان پکڑنے کا مضمون مولوی صاحب کو اس قدر پسند ہے کہ اس پر یہی ایک دلیل کافی نہیں سمجھی بلکہ قرآن شریف سے اور بھی مشرح اور مفصل احکام کان پکڑنے کے متعلق نکالے ہیں۔ چنانچہ دوسری دلیل صفحہ ۹۵ سے شروع ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ فصل لربك وانحر میں بھی کان پکڑنے کا حکم ہے۔ اس مشرح و مفصل حکم کی تشریح میں بھی مولوی صاحب کو تیرہ صفحے لکھنے پڑے ہیں فصل لربك وانحر کا ترجمہ "نماز پڑھ اپنے رب کی اور قربانی کر" کی بجائے مولوی صاحب یوں کرتے ہیں "تو اپنے رب کی نماز پڑھا کر خاص کر اپنے وجود کے اونٹ (کان) کو ذبح (ذلیل و حقیر یعنی پکڑا) کر ہر تکبیر کے ساتھ" مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ نحر تو اونٹ کی قربانی کو کہتے ہیں مگر یہاں اونٹ کی قربانی کا ذکر نہیں بلکہ انسان کے وجود میں جو اونٹ ہے اس کی قربانی مراد ہے اور وہ وجود کا اونٹ کان ہے کیونکہ جس طرح اونٹ سے بہت نفع پہنچتا ہے کان سے بھی بہت نفع پہنچتا ہے۔ اور اس کے ذبح کرنے سے مراد اس کا ذلیل کرنا ہے اور ذلیل کرنے سے مراد اس کو پکڑنا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نماز میں ہر تکبیر کے ساتھ کان پکڑنے کا حکم مشرح و مفصل قرآن شریف میں موجود ہے۔

(۱) نماز کی رکعتیں معلوم کرنے کے لئے بھی مولوی صاحب کو بہت کچھ محنت کرنی پڑی ہے اور یہ مسئلہ پورے ۵۸ صفحوں کی تشریح کے بعد حل ہوا حالانکہ ہر ایک حکم دین اسلام کا قرآن شریف میں ایسا مشرح و مفصل موجود تھا کہ دوسری کتاب کو ہاتھ لگانا خدا کی نافرمانی میں داخل تھا۔ مگر مولوی صاحب نے اپنے ہم خیالوں کو اگر حدیث کو ہاتھ لگانے سے بچایا جہاں چند سطروں میں رکعتوں کا مضمون آجاتا ہے تو پچاس صفحے رکیک تاویلوں کے ان کے سپرد کئے کہ ان کو پڑھ کر خدا کے حکم کی نافرمانی کیا کریں۔ کیونکہ جو چیز قرآن شریف میں مشرح و مفصل موجود تھی مولوی صاحب اسی کی تشریح و تفصیل کرنے بیٹھ گئے۔ رکعتوں کا کسی نماز میں دو کسی میں تین کسی میں چار ہونا تو ذیل کی آیات میں مشرح و مفصل موجود ہے۔ | قرآن سے نماز کی رکعتوں کی تعداد

الحمد للہ فاطر السموات والارض جاعل الملائکۃ رسلا اولی اجنحۃ مثنیٰ وثلث وربع یزید فی الخلق ما یشاء۔ اس کا لفظی ترجمہ صرف اس قدر ہے "سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو رسول بناتا ہے۔ دو تین اور چار چار پروں والے جو چاہتا ہے پیدائش میں بڑھاتا ہے"۔ مگر اس کے معنے مولوی عبداللہ صاحب یوں کرتے ہیں:۔

"پڑھا کرو (اے ہر ایک اہل آسمان و اہل زمین) الحمد (یعنی پانچوں نمازیں) واسطے راضی کرنے اللہ کے۔ کیونکہ وہ فطرت پاک پیدا کرنے والا ہے۔ تم تمام آسمان والوں (فرشتوں کی) اور تم تمام روئے زمین والوں (جن و انس) کی (چونکہ تم فطرت اللہ میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہو اس لئے نمازیں

پڑھتے رہا کرو تاکہ جبر نقصان ہوتا رہے اور اللہ وہ ہے) جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمہاری طرف جو لانیوالے تمہاری صلوٰتوں یعنی رکعتوں کے ہیں جن کا حق یہ ہے کہ وہ دو دو بار ادا کی جاویں اور تین تین بار اور چار چار بار مطابق تعلیم کتاب اللہ (یعنی جس وقت کی اللہ تعالیٰ نے دو رکعتیں مقرر کردی ہیں اس کی دو پڑھو جس کی تین فرمائی ہیں اس کی تین ادا کرو جس کی چار معین کی ہیں اس کی چار پڑھو) اس سے اللہ جبر نقصان کرنا چاہتا ہے۔ تمہاری تبدیل شدہ فطرت کا جس قدر انسان چاہتا ہے (یعنی جس قدر نماز میں توجہ و خشوع کرتا ہے)" صفحہ ۳۱۴

اس مشرح و مفصل حکم کی اس مفصل و مشرح تشریح پر کچھ اور بڑھانا لاحاصل ہے۔ ہاں اس سوال کا خوب جواب دیا ہے کہ کس کس نماز کے لئے دو رکعت ہیں کس کے لئے تین کس کے لیے چار اس کی تشریح و تفصیل قرآن کریم میں یوں بیان ہوئی ہے کہ نماز قصر بحالت اشد خوف امام کی دو رکعت ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا سے معلوم ہوتا ہے اور قیاس یہ چاہتا ہے کہ مقتدی بھی دو رکعت ہی ادا کریں گو قرآن مجید میں باوجود مشرح و مفصل ہونے کے مقتدیوں کی ایک ہی رکعت کا ذکر ہے اور دوسری رکعت کا ذکر نہیں ہے۔ اور قصر چونکہ نصف ہوتا ہے اس لئے پوری نماز بحالت اشد امن چار رکعت ہوئی۔ اور اشد امن دن کے تین وقتوں میں ہوتا ہے۔ یعنی ظہر عصر اور عشا اور صبح کا وقت اشد خوف کا ہوتا ہے۔ کیونکہ "صبح کے وقت نیند کے ہاتھوں انسان بالکل بے بس و بے اختیار و لاچار ہوتا ہے" پس اس وقت اشد خوف والی نماز یعنی دو رکعت پڑھنی چاہیئے۔ اور "شام کے وقت بھی انسان کاروبار معیشت کے بکھیڑوں میں سرگرداں حیران و پریشان ہوتا ہے اور سخت مجبور ہوتا ہے ..... پس یہ درمیانہ وقت ہے کہ نہ تو انسان اس وقت بالکل مردہ و بے اختیار ہوتا ہے بمثل صبح کے اور نہ ظہر کی طرح کامل فراغت و اطمینان ہوتا ہے" پس اس کی نماز بھی درمیانہ ہوئی یعنی تین رکعت۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل جو حدیث میں محفوظ ہے یہ بتلائے کہ نماز صبح دو رکعت اور نماز مغرب تین رکعت اور ظہر، عصر، عشا چار چار رکعت ہیں تو یہ قابل قبول نہیں۔ بلکہ اس بنا پر دو تین چار رکعت نماز پڑھنا۔ شرک کفر فسق ظلم ہے۔ خدا کے حکم کی نافرمانی ہے۔ لیکن جب مولوی عبداللہ صاحب مذکورہ بالا وجہ بیان کردیں تو پھر یہ عین حکم الٰہی ہے!

فرقہ اہل قرآن اور ان کی نماز

مولوی عبداللہ صاحب کے آجکل کے بعض پیروان تشریحات سے تنگ آکر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے حدیث کی عینک سے قرآن کو پڑھا ہے۔ مگر جو شخص بھی اقیموا الصلوٰۃ

کے حکم کو منجانب اللہ مان کر اس کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ بغیر حدیث کی عینک کے قرآن کو نہیں پڑھ سکتا خواہ وہ ایک سچے مسلم کی طرح آنحضرت صلعم کے قول و فعل کو بسر و چشم قبول کرے۔ اور خواہ مولوی عبداللہ کی طرح ان چیزوں کو پس پشت پھینکتا ہوا آخر کئی سو صفحات کی تاویل رکیک سے اسی کے مطابق نماز بنا لے۔ ہاں اب اس فرقہ میں نہ اباحتی گروہ پیدا ہوتا جا رہا ہے جو کسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اور مولوی عبداللہ نے تو صرف اذکار نماز میں کچھ تغیر کیا تھا۔ ان لوگوں نے پانچ نمازوں کی تین نمازیں بھی بنائی ہیں۔ اور ہر نماز صرف دو رکعت رکھی ہے اور ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ ہے۔ اور رکوع قعدہ وغیرہ کو بالکل نکال دیا ہے۔ کیونکہ حدیث تو مولوی صاحب نے ان سے چھڑا دی اور مولوی صاحب کی رکیک تاویلیں ان کا دماغ قبول نہیں کرتا۔ مگر حدیث کی عینک کو پورے طور پر ابھی انہوں نے بھی اتار کر نہیں پھینکا۔ کیونکہ سورہ فاتحہ کو نماز میں پڑھتے ہیں حالانکہ قرآن شریف میں کہیں حکم نہیں کہ سورہ فاتحہ نماز میں پڑھی جائے ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی میں اول سبعًا من المثانی سے فاتحہ مراد لینا خلاف تشریح و تفصیل ہے۔ پھر وہاں یہ نہیں لکھا کہ اس کو نماز میں پڑھا کرو۔ پھر نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم بھی کہیں نہیں فاقرؤا ما تیسر من القراٰن اور ما تیسر منہ کے ساتھ فی الصلوٰۃ نہیں۔ پھر تین وقت نماز پڑھنے کا بھی ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل کے ظاہر معنی تو صرف یہی ہیں کہ آفتاب کے زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز پڑھتے رہو۔ مشرح و مفصل حکم تین وقت نماز پڑھنے کا کہیں نہیں۔ پھر خوف کے وقت قصر کے متعلق تو یہ فرمایا کہ ایک گروہ امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ جائے اور دوسرا گروہ دوسری رکعت پڑھ جائے۔ اب یہ کون بتائے کہ یہ قصر نماز امام کی ہے یا مقتدیوں کی۔ مولوی عبداللہ تو کہتے ہیں کہ قصر امام نے کی ہے پس اصل نماز چار رکعت ہوئی۔ ان کے نئے ہمخیال کہتے ہیں قصر مقتدیوں نے کی ہے اصل نماز دو رکعت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا حکم تو ایک ہی ہوگا یا تو مولوی عبداللہ خلاف قرآن کرتے رہے یا ان کے نئے پیرو خلاف قرآن کر رہے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کون کرے۔ مشرح و مفصل حکم موجود ہونے کے باوجود خود استاد اور شاگرد میں اس قدر اختلاف ہے۔ دوسروں کو الگ رکھو۔ اور ابھی معلوم نہیں کہ آیندہ کیا اختلاف پیدا ہوں گے۔

مولوی صاحب اور انکے شاگردوں میں اختلاف باوجودیکہ قرآن مفصل ہے

مولوی عبداللہ صاحب کو قرآن شریف کے مشرح و مفصل احکام میں دو اور تین اور چار رکعتیں نظر آتی ہیں۔ ان کے پیروؤں کو دو نظر آتی ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب کو نماز شروع کرتے وقت کان پکڑنے کا حکم مشرح و مفصل نظر آتا ہے ان کے پیرووں کو نظر نہیں آتا۔ مولوی عبداللہ صاحب کو پانچ

نمازیں نظر آتی ہیں۔ اُن کے پیروؤں کو صرف تین دکھائی دیتی ہیں۔ مولوی صاحب کو دو سجدوں رکوع جلسہ قعدہ کا حکم نظر آتا ہے۔ شاگردوں کو یہ باتیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اب فرمائیے ان میں فیصلہ کون کرے۔ معلوم ہوا ان سب کا اعتقاد یہ ہے کہ باوجود مشرح و مفصل ہونے کے کچھ مزید تشریح و تفصیل کی ضرورت باقی ہے جس میں اختلاف ہو رہا ہے اور وہ اختلاف ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنے والا اب کوئی نہیں۔ استاد کچھ کہتا رہا۔ شاگرد کچھ کہتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان میں سے کس کا تتبع کریں اور ابھی آئندہ اور بھی ذہین طبیعتیں سب قیدوں سے آزاد پیدا ہوں گی وہ ان نئے شاگردوں کی بھی وہی گت بنائیں گی جو انہوں نے استاد کی بنائی ہے۔ پس باوجود مفصل و مشرح ہونے کے اب تک یہ پتہ فی الحقیقت نہ لگا کہ جس الصلوٰۃ کا حکم اقیموا الصلوٰۃ میں قرآن شریف نے دیا ہے وہ کیا ہے ÷

عالم اسلامی کا ارکان نماز پر اتفاق

پس جب خود اہل قرآن کے نزدیک ان لوگوں کے نزدیک بھی جو دین اسلام کے کل احکام کو قرآن کریم کے اندر مشرح و مفصل مانتے ہیں۔ قرآن شریف کی عبارات کی مزید تشریح و تفصیل بکار ہے۔ تو اس تشریح و تفصیل کی ضرورت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی تھی۔ آپ نے یہ تشریح و تفصیل اپنے قول اور اپنے عمل سے کر کے دکھا دی اسی کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ مولوی عبداللہ اور ان کے شاگردوں میں جو اختلاف نماز کے اوقات۔ نماز کی رکعات۔ نماز کے ارکان میں ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف کے احکام میں سے یہ صرف ایک حکم ہے۔ اس کا بڑے اصول اہل قرآن اب تا قیامت کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا اور یہ ابھی چند سو آدمیوں کی حالت ہے جو پندرہ بیس سال کے اندر اندر پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن قربان جائیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ایسی تشریح و تفصیل کی جس پر مشرق سے لیکر مغرب تک تیرہ سو سال کے اندر تمام مسلمانوں کا اتفاق موجود ہے۔ مشرق بعید میں ملک چین میں جا کر دیکھ لو یا سمندر کے اندر علیحدہ علیحدہ جزائر میں دیکھ لو۔ ہندوستان کے میدانوں یا پہاڑوں میں دیکھ لو۔ ترکستان، افغانستان بلوچستان میں دیکھ لو۔ روس اور روم میں دیکھ لو۔ عرب اور افریقہ کے ریگستانوں میں دیکھ لو۔ یورپ کی اسلامی آبادیوں میں دیکھ لو۔ وہی پانچ نمازیں۔ وہی ان کے اوقات۔ وہی ان کی رکعات۔ وہی ان کے ارکان۔ بیسیوں فرقے ہیں لیکن نمازوں کے اوقات رکعات اور ارکان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور نہ تیرہ سو سال میں کبھی ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوئی نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ بھی مسلم امر ہے کہ صحابہ رضؓ کے زمانہ میں باہم اختلافات بھی شروع ہو گئے تھے۔ پس اگر وہ نماز جو تمام اسلامی دنیا اس وقت پڑھتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو خود صحابہ نے ہی اس نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے

ساتھ ہی تبدیل کر لیا۔ مگر اس کو اہل قرآن بھی نہیں مانتے بلکہ مولوی عبداللہ صاحب تو سینکڑوں سال تک اصل حالت پر نماز کو مانتے ہیں۔ اور سینکڑوں سال کے بعد احادیث کا بننا مانتے ہیں۔ تو دوسری صورت یہ ہے کہ نماز اس وقت تبدیل ہوئی جب اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ اور مسلمان نہ صرف عرب، ایران، ترکستان، شام، مصر میں پھیل چکے تھے۔ بلکہ ہندوستان چین تک بھی پہنچ چکے تھے۔ اب وہ کونسی طاقت تھی جس نے تمام فرقوں کو یک مرتبہ اس نماز کے چھوڑنے پر ایسا مجبور کر دیا کہ وہ اپنے سارے اختلافات کے باوجود اتنا نہیں کرتے کہ کوئی فرقہ یا کسی فرقہ کا کوئی آدمی ہی اصل نماز کو محفوظ رکھے۔ اور وہ کون سے ذرائع تھے جن کو استعمال میں لا کر ہزارہا میلوں اور الگ الگ ملکوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں سے ایک ہی وقت اصل نماز چھڑا کر ایک نئی نماز ان میں مروج کر دی گئی۔ اور اس کا کرنے والا کون تھا؟ خیالات کی تبدیلی تو آہستہ آہستہ دور تک پہنچ جاتی اور اپنا اثر پھیلا دیتی ہے کیونکہ خیالات کے مالک تھوڑے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا عمل جو ادنیٰ سے اعلیٰ تک میں پھیلا ہوا ہو۔ اور جو مشرق سے مغرب تک سب لوگوں میں یکساں پایا جاتا ہو اور جس کا اظہار ہر روز لازماً پانچ مرتبہ ہوتا ہو۔ اس میں فوراً تبدیلی ہونی تو ممکن نہیں۔ اور تدریجاً تبدیلی پیدا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی کبھی مخالفت بھی کہیں ہوئی ہو۔ بالخصوص فرقہائے مخالف ضرور تھا کہ اس میں ایکدوسرے کے خلاف پہلو لیتے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نشان بھی اس مزعومہ اصلی نماز کا نہیں ملتا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے تو یہ احتیاط کی ہے کہ اسی مشکل کو دیکھ کر نماز کے اوقات اسکی رکعات اس کے ارکان کو وہی رکھا ہے مگر ان کے ہم خیالوں نے بالکل ہی نئی نماز تجویز کرتے وقت ادنیٰ فکر سے بھی کام نہیں لیا۔ اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ جو بات وہ پیش کرتے ہیں اسے کوئی عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی کہ مسلمانوں کے کل فرقے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے سب کے سب ایک ہی وقت میں اصل نماز کو چھوڑ کر ایک نئی نماز کے بنانے اور اس کے مطابق احادیث وضع کرنے پر متفق ہو گئے ہوں۔ جو بات محال عقلی ہے اس پر دلائل دینے کے کیا معنی؟

فروعی اختلافات

اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث کو مان کر بھی تو نمازوں میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ وہ اختلاف اوقات میں نہیں۔ رکعات میں نہیں۔ ارکان میں نہیں۔ باقی رہیں چھوٹی چھوٹی باتیں۔ ہاتھ سینے کے اوپر باندھے جائیں یا نیچے۔ رفع یدین کیا جائے یا نہیں۔ آمین بلند آواز سے کہی جائے یا ہلکی آواز سے ان میں اختلاف ہونا ایک بالکل معمولی بات ہے اور اس کی اصل وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معاملات میں وسعت رکھی ہے کبھی ایک طرح عمل

کر لیا ہے۔ کبھی دوسری طرح۔ لیکن جس طرح تمام مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے۔ تمام مسجدیں جہاں کہیں ہوں ایک ہی رُخ یعنی قبلہ رخ بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح نماز بھی تمام مسلمانوں کی ایک ہے۔ اس کے وہی اوقات ہیں۔ وہی رکعات ہیں۔ وہی ارکان ہیں اور یہ اس بات کا کہ یہی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ ایسا عظیم الشان تاریخی ثبوت ہے کہ جو شخص اس کو رد کرتا ہے وہ دنیا کے کسی تاریخی امر کو قبول نہیں کر سکتا۔

نبی کے دو الگ الگ کام آیات کا پڑھنا اور انکی تعلیم دینا

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم باوجود تفصیل کل شئی ہونے کے مزید تشریح و تفصیل چاہتا ہے اسی کے احکام کی تشریح و تفصیل ہی نبی کریم صلعم نے فرمائی۔ حکم ہوا اقیموا الصلوٰۃ آپ نے نماز پڑھکر دکھادی کہ صلوٰۃ سے یہ مراد ہے۔ پس اگر ہم لغت کے محتاج ہیں تو اس سے بہت بڑھکر آنحضرت کی حدیث کے محتاج ہیں اور اگر ہم آنحضرت صلعم کی حدیث کے محتاج نہ ہوں گے تو مولوی عبد اللہ صاحب کی تشریحات کے محتاج ہونگے اسکے محتاج نہ ہونگے تو ان کے کسی پیرو کی تشریحات کے محتاج ہوں گے۔ اب یہ ایک شخص کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اس تشریح کو قبول کرے جو مولوی عبد اللہ اور ان کے ہم خیال پیش کرتے ہیں اور چاہے اس تشریح کو قبول کرے جو خود مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گو اہل قرآن بھی تشریح کرنے پر مجبور ہوں۔ مگر کیا خود قرآن شریف بھی اپنی کسی تشریح کی حاجت بتاتا ہے۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم رسول کے دو کام بتاتا ہے ایک یہ کہ وہ اس کی آیات دوسروں کو پڑھ کر سنا دے دوسرا یہ کہ وہ ان کو کتاب کی تعلیم دے۔ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ مولوی عبد اللہ صاحب نے یہ خوب ہتھیار ایجاد کیا ہے کہ ہر جگہ واو عاطفہ کو تفسیری قرار دے لیا اور چھٹی ہوئی لیکن یہاں یہ ہتھیار کام نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ تلاوت آیات یعنی وحی الٰہی کے پڑھ کر سنا دینے کے بعد دوسرا جملہ ہے ویزکیھم اور ان کا تزکیہ کرتا ہے یعنی ہر ایک قسم کی آلائش سے ان کو پاک کرتا ہے۔ اب ظاہر کہ تلاوت آیات اور تزکیہ ایک کام نہیں یعنی یوں نہیں کہہ سکتے کہ اُن پر آیات پڑھتا ہے یعنی ان کا تزکیہ کرتا ہے یہ دو الگ الگ کام ہیں۔ تلاوت آیات اور تزکیہ ایک شے نہیں۔ پھر اس کے بعد تیسرا کام لکھا ہے کہ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ جس طرح تلاوت آیات اور تزکیہ ہم معنی نہیں اسی طرح تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت ہم معنی نہیں۔ یہ الفاظ اور مفہوم دونوں کے ساتھ ہنسی ہوگی کہ ہم کہیں کہ معنی یوں ہیں کہ رسول ان پر آیات پڑھتا ہے یعنی ان کا تزکیہ کرتا ہے یعنی کتاب و حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے۔ یہ خوب تفسیر ہے۔ سیدھے سادے الفاظ تلاوت آیات کی تفسیر کی کہ اس سے مراد تزکیہ ہے اور پھر تزکیہ

کی تفسیر کی کہ اس سے مراد تعلیم کتاب وحکمت ہے بھلا ان الٹی تفسیروں سے حاصل کیا۔ قرآن کریم جیسے پاک اور پرمعنی کلام سے یہ تمسخر ہے کہ تلاوت آیات کی تفسیر تزکیہ سے کی جائے اور تزکیہ کی تفسیر تعلیم سے کی جائے۔

تعلیم کا مفہوم

الغرض یہ صاف بات ہے کہ یہاں تین کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمائے ہیں۔ ایک آیات قرآنی کا پڑھکر سنا دینا۔ دوسرے اپنے پیروؤں کو آلائشوں سے پاک کرنا جو آپ اپنی قوت قدسی اور دعاؤں اور عقدہ ہمت اور نمونہ سے کرتے تھے اور تیسرا کام تعلیم کتاب وحکمت ہے گویا تعلیم محض تلاوت سے الگ ہے اب تعلیم کتاب وحکمت سے مراد یہ تو ہو نہیں سکتی کہ ان کو قرآن شریف حفظ کراویں۔ حفظ کرنا ان کا کام تھا آپ کا کام ان پر آیات کا پڑھ دینا تھا۔ حفظ کرانا کوئی کام نہیں۔ آپکا کام تلاوت آیات تھا۔ اور صحابہ آپ کو پڑھتا سن کر حفظ کر لیتے تھے۔ علاوہ ازیں استاد جب شاگرد کو تعلیم دیتا ہے تو وہ صرف کتاب پڑھ کر نہیں سناتا۔ بلکہ اس کے اصل مطالب اور منشا سے اُسے آگاہ کرتا ہے پڑھ کر سنا دینا اور تعلیم دینا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ چنانچہ مولوی عبد اللہ صاحب نے خود بار بار اپنی کتابوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن کریم میں نبی صلعم کو حکم ہوتا ہے کہ ان اتلوا القرآن میں تم پر قرآن کو پڑھ دوں لیکن اتلوا القرآن کے یہ معنی نہیں کہ اس کے سوا دوسرا کوئی کام نہ کروں قرآن کی تلاوت بھی بے شک ایک کام ہے۔ مگر دوسرا کام تعلیم بھی ہے جس کو الگ بیان فرمایا اور تعلیم دینے کے یہی معنے ہیں کہ جو باتیں اس میں قابل تشریح ہیں آپ ان کی تشریح فرما دیں ورنہ تلاوت قرآن کے علاوہ تعلیم قرآن کو بیان کرنا بے سود تھا۔ اور یہ آیت جس میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو الگ کام بیان کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں چار مختلف جگہوں پر آتی ہے۔

قرآن کا پڑھنا اور اس کا بیان دونوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے بتلائے ہیں

گو آیت مذکورہ بالا اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ قرآن شریف نے تعلیم کو تلاوت سے الگ بیان کر کے اس کے معانی کی تشریح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام قرار دیا ہے مگر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ایک اور موقعہ پر قرآن کریم کی تشریح کی ضرورت بتائی ہے۔ فرمایا ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ بے شک ہم پر ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھ دینا۔ پھر جب ہم اس کو پڑھ دیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر ہم پر ہے اس کی وضاحت کر دینا۔ اب اس جگہ اللہ تعالیٰ نے تین باتیں بیان فرمائیں یعنی ایک جمع قرآن دوسرے اس کا پڑھ دینا۔ تیسرے اس کا بیان۔ بیان کیا چیز ہے۔ مفردات میں ہے وسمی الکلام بیانا لکشفہ عن المعنی المقصود لاظہارہ یعنی کلام کو بیان کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اس معنی کو واضح کرتی ہے جس

کا ظاہر کرنا مقصود ہے اس معنی میں خود قرآن شریف کو بیان کہا ہے۔ ھذا بیان للناس یعنی یہ لوگوں کے لیے معنی مقصود کو ظاہر کرنے والی چیز ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی ثم ان علینا بیانہ میں مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ بیانہ میں ضمیر خود قرآن شریف کی طرف ہے پس یہاں مراد قرآن کا بیان ہے۔ مضاف اور مضاف الیہ دو الگ الگ چیزیں ہیں جس طرح قرآن اور اس کا جمع کرنا دو باتیں ہیں۔ اور قرآن اور اس کا پڑھ دینا دو باتیں ہیں اسی طرح قرآن اور اس کا بیان دو باتیں ہیں۔ اس لئے یہاں وہ دوسرے معنی مقصود ہیں جن کو امام راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے وسمی ما یشرح بہ المجمل والمبہم من الکلام بیاناً نحو قولہ ثم ان علینا بیانہ یعنی جو چیز اجمال اور ابہام والی بات کی تشریح کرتی ہے اسے بیان کہا جاتا ہے۔ اور وجہ اس کی بھی وہی ہے کہ وہ معنی مقصود کو کھول دیتی ہے اس معنی کی مثال خود امام راغب نے بھی یہی آیت زیر بحث دی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہاں تین کام اپنی طرف منسوب فرمائے ہیں۔ قرآن کا جمع کرنا۔ قرآن کا پڑھ دینا۔ قرآن کی تشریح یا وضاحت کرنا یہی تشریح احادیث میں پائی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ یہ کام تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ سو یہ اسی طرح ہے جس طرح پڑھنا بھی اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے ذریعہ سے اپنے نبی پر پڑھا تو نبی نے لوگوں پر پڑھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے معنی کی وضاحت نبی پر ظاہر فرمائی تو نبی نے دوسروں پر ظاہر فرمائی۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کو نبی کے سینہ میں جمع کیا تو نبی نے دوسروں کے سینوں میں اسے جمع کیا۔ بہر حال تین کام الگ الگ بیان کئے اور یہاں واؤ عاطفہ بھی پہلے دو میں ہے۔ لیکن ان علینا بیانہ سے پہلے واؤ نہیں کہ اسے تفسیری کہہ کر پیچھا چھڑا لیا جائے بلکہ ثم سے اسے الگ کر کے ظاہر کر دیا کہ وہ الگ کام ہے۔

بیان کا مفہوم

قرآن کریم مفصل ہے مگر مزید تشریح کی ضرورت ہے

اوپر کی عبارت میں امام راغب نے بیان کے معنی کرنے میں لفظ اجمال و ابہام کو استعمال کیا ہے اور یہ شاید بعض لوگوں کو ناگوار گذرے کیونکہ قرآن کریم اپنے آپ کو مفصل کہتا ہے۔ اور تفصیل کل شیء کہتا ہے سو یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے الفاظ نسبتی ہوتے ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب نے قرآن شریف کے اندر مجاز اور کنایہ اس قدر مانا ہے کہ وہ اپنا سارا کام ہی اس سے نکالتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مجاز و کنایہ اجمال میں سے ہی ہیں۔ اور سب اہل قرآن اپنی اپنی تشریح الگ الگ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ تشریح اور وضاحت کے اصول کو باوجود قرآن شریف کو مفصل ماننے کے انہوں نے بھی مانا ہے یوں تو قرآن شریف نے توریت کے متعلق بھی فرمایا ہے ثم اتینا موسی الکتاب تماما علی الذی احسن و تفصیلا لکل شیء وھدی ورحمۃ (الانعام - ۱۵۵) جہاں حضرت موسیٰ کی کتاب یعنی

توراۃ کو کل چیزوں کی تفصیل فرمایا ہے۔ اور ایسا ہی دوسری جگہ فرمایا وکتبنا لہ فی الالواح من کل شیئ موعظۃ وتفصیلا لکل شیئ (الاعراف۔ ۱۴۵) یہاں بھی توریت میں ہر شے کی تفصیل بیان فرمائی۔ پھر باوجود توریت کی موجودگی کے حضرت داؤد کو زبور دی اور حضرت عیسیٰ کو انجیل دی۔ آخر وہ بھی بلا ضرورت نہ تھیں حالانکہ اگر کل شیئ کی تفصیل توریت میں موجود تھی تو انجیل و زبور کا دینا بالکل فضول تھا۔ اہل قرآن حدیث کو اس لئے فضول ٹھہراتے ہیں کہ قرآن میں ہر شے کی تفصیل ہے۔ لیکن اگر اس دلیل کو صحیح مانا جائے تو توریت میں تو ہر شے کی تفصیل تھی۔ پھر انبیائے بنی اسرائیل کو کتابیں کیوں دی گئیں۔ وہ تمام کتابیں جن میں حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل بھی ہیں اس دلیل کے رو سے نعوذ باللہ فضول ٹھہریں۔ اسی طرح ایک طرف توریت کو تفصیل کل شیئ کہا اور دوسری جگہ قرآن کریم کو اس کی اور سب کتب منزلہ کی تفصیل ٹھہرایا ہے۔ وما کان ھذا القرآن ان یفتری من دون اللہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین (یونس۔ ۳۷) یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے بھیجے سوا افترا کر لیا گیا ہے لیکن اسکی تصدیق ہے جو اس سے پہلے موجود ہے اور کتاب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں رب العالمین کی طرف سے ہے۔ پس تفصیل کا لفظ ایک نسبتی لفظ ہے *

تفصیل کل شیئ سے مراد

علاوہ ازیں تفصیل کل شیئ میں دنیا کی ہر ایک چیز تو بہر حال مراد نہیں۔ اہل قرآن نے بھی اب تک آریوں کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ ساری دنیا کے سائنس قرآن شریف میں موجود ہیں تاریخ جغرافیہ ہندسہ وغیرہ کو چھوڑو۔ دنیا کے مختلف پیشوں کا ذکر قرآن شریف میں کہاں ہے۔ دنیا کی ساری تاریخ کہاں ہے اس لئے اہل قرآن کو بھی کل شیئ پر یہ قید لگانی پڑی کہ دین کی کل باتیں۔ لیکن دین تو بہت سے اصول اور بے شمار فروع پر حاوی ہے۔ مثلاً سیاست بھی دین میں داخل ہے معاشرت بھی تمدن بھی اگر یہ امور دین میں داخل نہ ہوتے تو قرآن شریف ان کے اصول کو کیوں بیان فرماتا۔ لیکن ان ہی امور کے فروع ہزارہا باتوں پر مشتمل ہیں جن پر ایک زمانے کے اور ایک سوسائٹی کے انسان حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان کا ذکر قرآن شریف میں کہیں نہیں ہے۔ اسی طرح گذشتہ انبیاء کے تذکروں کو بھی دین میں داخل کیا کیونکہ ان کا ذکر قرآن شریف میں کیا۔ مگر باایں یہ نہ کیا کہ تمام انبیاء کے مفصل تذکرے قرآن شریف میں کر دیئے ہوں بلکہ بعض انبیاء کی زندگی کے نہایت قلیل واقعات کا ذکر کیا اور بعض کے متعلق تو صاف فرما دیا کہ رسلا لم نقصصھم علیک بعض رسولوں کا ہم نے تم پر کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کے نام بھی قرآن شریف میں نہیں تفصیل کل شیئ کس طرح ہوا۔ اب قرآن

شریف کے محاورہ کو دیکھیئے ایک ملکہ کی نسبت فرماتا ہے واوتیت من کل شئی اس کو ساری چیزیں دی گئیں۔ اب اہل قرآن کے اصول کی رو سے ہم اس پر اس قدر حد بندی تو لگا سکیں گے کہ بادشاہت کے متعلق کل چیزیں اس کو دی گئیں۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں جس طرح تفصیل کل شئی میں کل امور دینی مراد لیتے ہیں۔ ایسا ہی ذوالقرنین کے ذکر میں آتا ہے واٰتیناہ من کل شئی سببا۔ ہم نے اس کو ہر ایک چیز کے سامان عطا فرمائے۔ یہاں بھی زیادہ سے زیادہ بادشاہت کے سامان کی قید اصول اہل قرآن کی رو سے لگانی چاہیئے مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اس ملکہ کو اور ذوالقرنین کو بادشاہت کے وہ سامان یا بادشاہت کی وہ چیزیں بھی دی گئی تھیں جو آج ایک طاقتور حکومت کے ہاتھ میں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کیا یہ آہن پوش۔ یہ ۱۷ انچہ دہانہ کی توپیں یہ ہوائی جہاز یہ مشین گنیں یہ ریلیں یہ تار یہ ٹیلیفون وغیرہ سب چیزیں ان کو ملی تھیں ہر گز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کل شئی سے مراد صرف یہ ہے کہ ان کو وہ ہر ایک چیز دی گئی جس کی ضرورت ان کو دشمن کے مقابل پر تھی اسی طرح قرآن شریف تفصیل کل شئی بے شک ہے مگر اس لحاظ سے کہ جس قدر ضرورت اعدائے دین کے مقابل پر ہے جس قدر ضرورت دوسرے مذاہب کے متعلق ہے۔ جن سے دنیا میں اسلام کو کام پڑنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں قرآن شریف کو تفصیل کل شئی کہا ہے۔ وہاں ساتھ ہی دوسرے مذاہب کا بھی ذکر ہے۔ ماکان حدیثا یفتریٰ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شئی (یوسف ۱۱۱) یہ کوئی افترا کی ہوئی بات نہیں بلکہ جو کچھ اس سے پہلے موجود ہے اس کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل۔ اور دوسری جگہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب فرما کر اور بھی واضح کر دیا۔ ایسا ہی افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا (الانعام ۱۱۵) کتاب مفصل کا ذکر مخالفین کو مخاطب کر کے ہی کیا ہے اور درحقیقت ان سب آیات میں یہ بتایا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف نے دوسری جگہ بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن شریف میں اپنی صداقت کے تمام دعاوی اور ان کی دلائل اور مخالف مذاہب کے سارے اصول باطلہ اور ان کے بطلان کے دلائل موجود ہیں۔ اور یہ فی الواقع سچی بات ہے جیسا کہ سلسلہ احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اس بات کو بارہا مخالف مذاہب کے سامنے پیش کیا۔ اور اپنے تمام دلائل کا ماخذ قرآن شریف کو ثابت کر کے دوسروں سے یہ مطالبہ کیا جس کو آج تک کسی دوسرے مذہب کا کوئی پیرو اپنی کتاب کے متعلق ثابت نہیں کر سکا۔ اس میں فی الواقع قرآن شریف کی عظمت کا کمال نظر آتا ہے کہ ملک عرب کا ایک اُمی وہ کتاب دنیا میں پیش کرتا ہے جس نے نہ صرف سارے مذاہب کے اصول

باطلہ کو ہی بیان کر کے اُن کی غلطی کا اظہار کیا بلکہ اس کے دلائل بھی پیش کئے۔ حالانکہ وہ ایسا شخص ہے کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ تو ایک طرف رہا۔ وہ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتا۔ اور اسی طرح تمام اصول حقہ کو بیان کر کے ان کی صداقت کے دلائل بھی بیان کرتا ہے۔ لیھلك من ھلك عن بینة و یحیی من حی عن بینة۔ غرض کہ یہ قرآن شریف کا ایک عجیب معجزہ ہے کہ یہ دعویٰ بھی خود کرتا ہے اور دلیل بھی خود دیتا ہے۔ اور اسی کی طرف تفصیل کل شیٔ میں اشارہ ہے کہ وہ ہر چیز جس کی ضرورت مخالف مذاہب یا اعدائے دین کے مقابلہ میں ہے وہ اس قرآن شریف کے اندر موجود ہے۔ اس کا پیرو اس کا محتاج ہے یہ نہیں کہ دوسری کتابوں کی طرح کتاب اپنے پیرووں کی محتاج ہو یہ پہلوں کی تصدیق بھی کرتا ہے یعنی یہ بھی سکھاتا ہے کہ فی الواقع تمام انبیا رخدا کی طرف سے آئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لئے ان پر کتابیں اتاریں اور ساتھ ہی ہر شے کی تفصیل بھی اس کے اندر موجود ہے یعنی جو غلطیاں ان میں داخل ہو گئیں ان کو بھی بتاتا ہے اور ان کے بالمقابل صحیح اصول کو بھی بیان کرتا ہے اور دعویٰ کے ساتھ دلائل بھی خود دیتا ہے اسی لئے فرمایا فیھا کتب قیمة کس قدر کمال کا معجزہ ہے کہ اول یہ بتایا کہ سب مذاہب خدا کی طرف سے ہیں پھر یہ بتایا کہ ان کی کتابوں میں تحریف ہو گئی۔ اور مرور زمانہ سے غلطیاں داخل ہو گئیں پھر جو اصولی غلطیاں تھیں وہ بتائیں۔ پھر ان غلطیوں کے دلائل دیئے۔ ان واقعات پر غور کرو اور پھر تصدیق الذی بین یدیہ و تفصیل کل شیٔ کو پڑھو تو معلوم ہو گا کہ واقعی یہ خدائے عالم الغیب کا کلام ہے۔ اور واقعی وہ شخص بھی خدا کی طرف سے تھا جس پر اس علمی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا یہ علمی معجزہ ظاہر فرمایا۔

اصول اور فروع کا فرق

ایک اور پہلو سے ہم اسی تفصیل کل شیٔ کے دعویٰ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے دین کے متعلق ہر معاملہ کے اصول کو بیان کر دیا ہے اور فروع میں سے بھی کچھ بیان کر دیا ہے نہ صرف دین اسلام کے اصول ہی یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان بلکہ سیاست، تمدن، معاشرت کے اصول بھی دنیا میں اختلاف مذہب کے اصول بھی۔ اس اختلاف میں فیصلے کے اصول بھی وغیرہ۔ مگر فروع کا نہ استقصا ہو سکتا تھا۔ اور نہ اس لاحاصل کوشش کو قرآن شریف نے کیا۔ ہاں بطور نمونہ اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں سے بھی کچھ بیان کر دیا۔ لیکن جملہ اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔ اور پھر یہ قاعدہ بھی بتا دیا کہ فروع میں جہاں کوئی امر متشابہ پیدا ہو اصول کی طرف رجوع کر کے اسے حل کیا جائے۔ اس لئے تفصیل کل شیٔ قرآن شریف ان معنوں میں بھی ہے کہ تمام اصول کی تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں۔

اور پوری وضاحت موجود ہے۔ وہاں کسی مزید توضیح کی چنداں حاجت نہیں۔ چنانچہ اس امر کو خود قرآن شریف نے بیان فرمایا ہے ھو الذی انزل علیك الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب و اخر متشابھات خدا وہ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں کچھ آیات محکم یعنی واضح المعنی صریح الدلالت ہیں۔ وہ کتاب کی اصل ہیں اور اور متشابہ ہیں یعنی جن کے معنی واضح نہیں۔ اب اس آیت نے صاف کر دیا کہ قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جو واضح المعنی نہیں۔ بلکہ ان کی مزید تشریح و توضیح بکار ہے۔ پس اگر قرآن شریف ایک طرف تفصیل کل شئ بھی اپنے آپ کو کہتا ہے تو دوسری طرف اپنے اندر کچھ آیات متشابہ بھی قرار دیتا ہے۔ ہم دونوں آیتوں کو اکٹھا پڑھیں گے اور ان میں سے ایک کے ایسے معنی نہیں کریں گے جو دوسری آیت کے خلاف ہوں اور دونوں میں تطبیق بھی درحقیقت خود اسی آیت نے کر دی ہے جو اس وقت زیر بحث ہے کیونکہ یہاں ایک حصہ کو واضح المعنی صریح الدلالت فرمایا دوسرے کو ایسا نہیں فرمایا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ آیات جو واضح المعنی صریح الدلالت ہیں وہ اصول کتاب ہیں بالفاظ دیگر قرآن کریم نے اصول کو لازماً ایسے الفاظ میں بیان فرما دیا ہے کہ ان کی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔ مگر فروع کو ایسے رنگ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کی مزید توضیح کی ضرورت ہے اور یہی ایک حکیم اور پرحکمت کتاب کا کام ہو سکتا تھا کہ اصول کو نہایت پختہ اور منضبط کر کے بیان کر دے اور فروع میں سے کچھ حصہ کو بیان کر دے کیونکہ تمام فروع کو بیان کر دینا گو خدائے عالم الغیب کی طاقت سے تو باہر نہیں۔ مگر ان تمام فروع کا برداشت کرنا ان سب کی حفاظت کرنا اور ان میں سے پھر اپنی ضرورت کے مطابق تلاش کرنا انسانی طاقت سے بالاتر تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ انسان پر وہ بوجھ ڈالے جس کی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس طرح تو یہ قرآن کریم کروڑوں نہیں اربوں صفحوں کی کتاب بن جاتی اور کوئی اس میں سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکتا نہ اسے یاد رکھ سکتا نہ اس کی حفاظت کا سامان ہو سکتا پس کمال حکمت سے ایک طرف اصول کو بالکل واضح اور صاف اور پختہ کر کے قرآن کریم میں ان سب کا ذکر کر دیا اور دوسری طرف فروع کے لئے اجتہاد کا دروازہ ہر زمانہ میں اس کی ضرورت کے مطابق کھلا رکھا اب چونکہ فروع ہمیشہ اصول پر عرض کی جاتی ہیں۔ اور اصول کے مطابق ہونی چاہئیں اس لئے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سبھی کچھ بتا بھی دیا کیونکہ جب ایک چیز کے علم حاصل کرنیکا ذریعہ بتا دیا۔ تو گویا اس کا علم ہی دے دیا اور اس لحاظ سے یعنی مجاز کے رنگ میں تفصیل کل شئ قرآن شریف اس معنی میں بھی ہے کہ اس میں سب چیزوں کا علم دے دیا کیونکہ سب چیزوں کے علم حاصل کرنے کا رستہ بتا دیا۔ چنانچہ اس آیت میں خود ہی اس قاعدہ کی توضیح بھی فرما دی وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من

عند ربنا۔ اور اس کی (یعنی متشابہ کی) تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ اور مضبوط علم والے وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے یعنی متشابہ کے معنی راسخ فی العلم لوگ ہی اصول پر معلوم کرتے رہیں گے کہ وہ سب کو اپنے رب کی طرف سے جانتے ہیں۔ راسخ فی العلم اُن کو اس لئے کہا کہ وہ ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بنیاد یہی ہے کہ وہ محکم اور متشابہ دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں اور محکم کے معنی تو ظاہر ہیں سو جس کے معنی میں کسی قسم کی بحث نہیں۔ متشابہ کو اس پر عرض کرنا خود ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہونا ہے پس یہ وہ قاعدہ ہے جو خود قرآن کریم نے تجویز فرمایا ہے۔

قرآن کریم میں متشابہات کی حکمت

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصول جو قرآن کریم نے اوپر بتایا ہے ساری مشکلات کو حل کر دیتا ہے قرآن شریف میں ایک رنگ میں سبھی کچھ موجود ہے مگر نہ اس طرح جیسے لفظ پرستوں نے خیال کر لیا ہے ہاں بیج کے طور پر اس میں سب کچھ ہے اور اس بیج کو درخت بنانے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے۔ متشابہ آیات کو صرف اسی قدر نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے معنی میں وضاحت نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ متشابہ آیات وہ ہیں جو بہت سے معنی کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ اور ایک طرف اگر آیات محکم نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے تاکہ ان کے متعلق شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ تو دوسری طرف متشابہ آیات کا کوئی کم احسان دنیا پر نہیں اس لئے کہ ان کے اندر وہ ذخائر علم بھرے پڑے ہیں جن سے آخر تک دنیا متمتع ہوتی رہے گی۔ وہ ذخائر علم بے شک اپنی خوراک ان اصول سے ہی حاصل کرتے ہیں جس طرح ایک درخت کی شاخیں غذا اپنی جڑھوں کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہیں۔ مگر بجائے خود وہ اس ہدایت میں جس نے دنیا کے آخر تک قائم رہنا تھا۔ اسی قدر ضروری عنصر ہیں جس قدر ضروری کہ محکمات ہیں اگر یہ قدرتی تقسیم قرآن شریف کے اندر نہ ہوتی جو اللہ تعالیٰ کا آخری کلام شریعت وہدایت تھا۔ تو وہ صحیفہ قدرت کے مطابق نہ ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا کہ جو قانون اس کی اس کتاب میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جو اس کے ہاتھوں نے بنائی ہے بعینہٖ وہی قانون اس کی اس کتاب میں بھی کام کرتا ہوا نظر آئے جو اس کے منہ کا کلام ہے۔ اور چونکہ یہ کمال اس کتاب میں ظاہر کرنا مقصود تھا اس لئے جس قدر قرآن کریم نے بار بار نظارہ قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے کسی الہامی یا غیر الہامی کتاب نے اس قدر توجہ نہیں دلائی ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنھار لاٰیات لاولی الالباب کے رنگ کی آیات اگر کوئی جمع کرنا چاہے تو سینکڑوں آیتیں قرآن شریف میں ملیں گی۔ پس جس طرح ایک مضبوط جڑوں کے درخت کے ہمیشہ نئے سے نئے پتے نکلتے رہتے ہیں اسی طرح تا قیامت قرآن شریف سے نئے سے نئے علم پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر ایک قسم کی

ضروریات کو وہ پورا کرتا رہے گا مگر وہ بطور ایک اصل کے ہوگا اور اس سے ہر قسم کی فروع پیدا ہوتی رہیں گی محکم اور متشابہ آیات اپنا اپنا کام کرتی رہیں گی۔ اور یوں دنیا کے لئے آخر تک روحانی غذا کے پیدا کرنے کا موجب ہوتی رہیں گی۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس میں کل فروع کا احاطہ فوری رنگ میں پائے وہ خدا کے کلام سے وہ توقع رکھتا ہے جو اس کے قانون کے خلاف ہے اور وہ نہ صرف قرآن کریم سے ہی ناواقف ہے بلکہ عقل انسانی سے بھی کام نہیں لیتا۔

باریکیوں کو اخذ کرنے والوں کے مدارج کا اختلاف

اس تمام بحث کو پڑھ لینے کے بعد کسی شخص کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ قرآن کریم کی آیات کی مزید تفصیل و تشریح کی بھی ضرورت ہے اور ان لوگوں نے بھی اپنے عمل سے اس کا اعتراف کیا ہے جنہوں نے اپنے قول سے اس کی تردید کی تھی۔ میں نے اوپر اللہ تعالیٰ کے اسی قولی کتاب کا اس کی فعلی کتاب سے مقابلہ کیا ہے اور اسی کو ذرا اور کھولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب یعنی اس کی مخلوقات میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوں تو وہ سب کے سامنے کھلی پڑی ہے لیکن اس کو دیکھنے میں سب یکساں نہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اس کے موٹے سے موٹے واقعات کو نہیں دیکھتے اور آنکھیں رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس کے نشانات سے گذر جاتے ہیں اور اور بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ مخلوقات سماوی اور ارضی کے اندر ایک باریک نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر فکر کرنے کی عادت رکھتے ہیں وہ پہلوں سے بہت زیادہ باریکیاں اس کھلی ہوئی کتاب میں سے اخذ کر سکتے ہیں۔ ان سے آگے ایک گروہ علم والوں کا ہے جنہوں نے اپنی باریک نگاہ سے قانون قدرت کی بعض باریکیوں کو ایسا اخذ کر لیا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کو عام نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور ان طاقتوں کو اپنے کام میں لاتے ہیں جن کو دوسرے نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک گروہ سائنس دانوں کا ہے جو خوردبین کی مدد سے ایسی ایسی مخفی باتوں کو دیکھ لیتے ہیں جن کو نہ صرف انسان کی چشم بینا ہی نہیں دیکھ سکتی بلکہ وہاں تک فکر و عقل کی بھی رسائی نہیں۔ یہی نظارہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب یعنی قرآن شریف میں نظر آتا ہے یعنی بہتیرے لوگ ہیں جو اس کو پڑھتے ہیں مگر اس کی موٹی موٹی باتوں سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ بعض پڑھتے ہیں اور اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

نبی کا فہم وحی خفی ہے

اور اس کی بہت سی باریک باتوں تک ان کی نگاہ جاتی ہے۔ اس سے اوپر ائمہ مجتہدین کا گروہ ہے جو فکر و تدبر سے کام لیکر اجتہاد کر کے اور بہت سے باریک مسائل کو قرآن شریف سے اخذ کرتے ہیں لیکن نبی کو جس پر وہ کلام نازل ہوتا ہے وہ خوردبین عطا کی جاتی ہے جس کی مدد سے وہ وہ کچھ دیکھتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ اور بہت سی باتیں جو کتاب اللہ میں ایک بیج کے رنگ میں موجود ہیں

نبی اپنے اس فہم سے جو اللہ تعالیٰ اسے خاص طور پر عطا کرتا ہے انہیں درخت کی صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ روشنی جو اس کو دی جاتی ہے وہ معمولی اجتہاد سے بالاتر اور زیادہ تیز روشنی ہوتی ہے اسی کو وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہے کہ جس قلب پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے اس کو اس کا خاص فہم بھی ملنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اس کو دوسروں کی طرح باہر سے نہیں دیکھتا بلکہ اندر سے دیکھتا ہے۔ اس کے قلب میں جب تک ایک خاص نور پیدا نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ اس وحی کو لینے کے قابل کیونکر ہو سکتا ہے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ صاف بتاتا ہے کہ وحی الٰہی پانے کا ہر ایک قلب سزاوار نہیں ہوتا پس یہی نور جس کی وجہ سے اس کا قلب مہبط وحی بنتا ہے۔ اس کو ایک خاص فہم عطا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور اسی خاص فہم سے کام لے کر یا وحی خفی کی مدد سے وہ ان امور دینی میں فیصلہ کرتا ہے جن کی وضاحت کتاب اللہ نے نہیں کی۔ اور اس وجہ سے کہ اس کو خاص فہم منجانب اللہ عطا ہوتا ہے اور خاص روشنی ملتی ہے۔ وہ خاص اختیارات رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ امت کے لئے ایک قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ اجتہاد میں غلطی کا امکان ہے۔ مگر اس کے فیصلۂ دینی میں غلطی کا امکان نہیں۔ مثلاً قرآن شریف میں صلوٰۃ کا حکم ہوتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتا دیتے ہیں کہ صلوٰۃ یہ ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ وہ غلط ہو یا قرآن شریف یا اللہ تعالیٰ کی منشاء کے خلاف ہو۔ اور کسی دوسرے شخص کو معلوم ہو جائے کہ وہ نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی وہ درست نہیں بلکہ قرآن شریف ایک دوسری طرز کی نماز چاہتا ہے۔ ایک فیصلہ دینی اگر قطعی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اس کا قبول کرنا سب امت کیلئے ضروری ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا قرآن شریف سے یہ ثابت ہے کہ نبی کو کوئی خاص فہم عطا ہوتا ہے! جس سے وہ امور دینی میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ بلا شبہ ایسا ثابت ہوتا ہے اور قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر گواہ ہیں۔ یوں تو کسی نبی کے متعلق فرمایا ولوطاً آتیناہ حکماً وعلماً کسی کے متعلق فرمایا ففررت منکم لما خفتکم فوھب لی ربی حکما وجعلنی من المرسلین یا فرمایا ولما بلغ اشدہ واستویٰ آتیناہ حکما وعلما۔ لیکن جامعیت کے رنگ میں ایک جگہ کوئی اٹھارہ انبیا کے نام لے کر فرمایا اولٰئک الذین آتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ (الانعام۔ ۸۹) یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور فیصلہ کرنے کا اختیار اور منصب سفارت (اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان) عطا فرمایا ہے اور دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ عام الفاظ میں فرمایا ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم

نبی کو خاص فہم دیا جاتا ہے

والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادالی من دون اللہ (آل عمران ۸۰) یہ کسی بشر کو شایاں نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور فیصلہ کرنے کا اختیار اور منصب سفارت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔ حکم کے معنی امام راغب نے ان الفاظ میں کئے ہیں۔ ان یقضی بشیئٍ علی شیئٍ فیقول ھو کذا ولیس بکذا یعنی ایک چیز کا دوسرے پر فیصلہ کیا جائے پس وہ فیصلہ کرنے والا کہے یہ ایسا ہے اور ایسا نہیں۔ پس ان آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے مرسلین کو کتاب دیتا ہے۔ منصب سفارت عطا فرماتا ہے وہیں ان کو حکم یعنی فیصلہ کرنے کی قوت یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ انبیاء سب بادشاہ نہیں ہوتے پس یہ فیصلہ صرف امور دینی میں ہی فیصلہ ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ حکم کے معنی لغت میں العلم والفقہ یعنی علم و فقاہت بھی لکھے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ فیصلہ کرنے کی قوت یا اختیار کے لئے علم و فقاہت بھی بکار ہے اور صحیح حکم یا فیصلہ چونکہ فقاہت سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے نبی کو حکم عطا کرنے میں دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں یعنی اس کو خاص فہم بھی دیا جاتا ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار بھی دیا جاتا ہے اس لئے بعض وقت یہ صرف فہم کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی حکمت کے معنی میں۔ مگر ظاہر ہے کہ کتاب اور نبوت کے ساتھ انبیاء کو جو حکم عطا کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد اختیار فیصلہ ہی ہے۔ یا کتاب کا وہ فہم جس سے وہ امور دینی میں فیصلہ کر سکتے ہیں معمولی فہم مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا تعلق نبوت سے کیا ہے یہ کوئی خاص بات ہے جو انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتی ہے۔ جس طرح آتیناہ حکمًا و علمًا میں علم سے مراد خاص علم ہے جو امور دینی کے متعلق منجانب اللہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ علم تو کم و بیش ہر ایک انسان کو دنیا میں ملتا ہے اور خدا کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص لکھنا سیکھتا ہے وہ بھی منجانب اللہ ہی علم لیتا ہے جیسا کہ فرمایا لایاب کاتب ان یکتب کما علمہ اللہ ان یکتب کاتب کو چاہئے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسا کہ اللہ نے اسے لکھنا سکھایا یا شکاری جانوروں کو شکار کرنا سکھانا یہ بھی علم اللہ ہی دیتا ہے حالانکہ اس کا دین سے کچھ بھی تعلق نہیں جیسے کہ فرمایا وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو سکھاتے ہو یعنی شکار کرنا سکھاتے ہو۔ تم اُن کو سکھاتے ہو اس سے جو اللہ نے تم کو سکھایا۔ پس گو خدا کا انسان کو علم دینا نہایت وسیع ہے مگر جب وہ نبی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کو ہم نے علم دیا تو اس سے مراد وہ عام علم نہیں جو انسان اپنی کوشش سے سیکھ لیتا ہے مگو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب سے اور اسی کی پیدا کردہ طاقتوں سے وہ

سکھتا ہے وہ بھی خدا کا ہی دیا ہوا علم ہے) بلکہ اس سے مراد وہ علم خاص ہے جو انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح حکم سے مراد وہ معمولی فہم یا دنیا کے قضایا میں فیصلہ نہیں ہو سکتا جس میں دوسرے انسان ان کے شریک حال ہیں بلکہ یہ وہ خاص فہم ہے جو وحی خفی سے ملتا ہے جس میں دوسرے انسان ان کے شریک حال نہیں اور یہ وہ اختیار فیصلہ ہے جو دینی امور میں ان کو دیا جاتا ہے جس میں دوسرے انسان ان کے شریک نہیں۔ پس یہ آیات قرآنی اس بات کا قطعی فیصلہ کرتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے اور ایسا فیصلہ کرنے کیلئے انہیں خاص فہم دیا جاتا ہے جسے وحی خفی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معمولی فہم انسانی سے ایک الگ روشنی ہے۔

نبی کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار

اس بات پر کہ نبی کو امور دینی میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے جس کو اصولی اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ کہ حکم تو اللہ کے لئے خاص ہے ان الحکم الا للہ نہیں حکم مگر اللہ کے لئے ولا یشرک فی حکمه احدا۔ اور اپنے حکم میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ایسا ہی اور بھی بہت سی آیات ہیں وما اختلفتم فیه من شیء فحکمه الی اللہ۔ واللہ یحکم لا معقب لحکمه۔ فالحکم للہ العلی الکبیر۔ تعجب ہے کہ ان آیات سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کو دنیا میں حاکم بننے کی یا حکم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آیات قرآنی کے وہ معنی کرنا جو صریحاً خلاف واقعات ہوں عقلمندی نہیں۔ دنیا میں حاکم بھی بنتے ہیں حکم دیتے بھی ہیں چلاتے بھی ہیں۔ مگر جلد بازی سے اس کا جواب یہ دیا جائیگا کہ امور دینی میں کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ جائے غور ہے کہ قرآن نے امور دینی کی قید کوئی نہیں لگائی نہ ان الحکم الا للہ میں امور دینی کی کوئی قید ہے نہ لا یشرک فی حکمه احدا میں امور دینی کی کوئی قید ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت کوئی حکم دینا شرک ہے تو خواہ ایسا حکم دنیا سے تعلق رکھتا ہو یا دین سے بات یکساں ہے۔ حکم میں شریک تو ہو گئے اور اگر یہ شرک نہیں تو پھر تمام آیات کے مفہوم کو ان الحکم الا للہ پیش کر کے بگاڑتے چلے جانا فی قلوبهم زیغ کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے۔ اصل بادشاہ دین و دنیا دونوں کا خدا ہی ہے۔ اور کچھ قوانین کے ماتحت جو اس نے بعض کو بعض کے ماتحت رکھا ہے اور اس کا حکم ماننے کو کہا ہے تو اس کو شرک فی الحکم قرار دینا سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ انسان عقل و فکر سے کام نہ لے۔ مثلاً کم از کم یہ تو مولوی عبداللہ صاحب کو بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امور سلطنت میں اولی الامر کی اطاعت یعنی ان کا حکم ماننے کا حکم دیا ہے۔ پس اگر وہ خود حکم دے کہ فلاں کی بات بھی مان لیا کرو تو یہ بھی اسی کا حکم ہوا

امور سیاست دین سے الگ نہیں۔ اگر یہ الگ ہوتے اگر یہ ہمارے دین کا جزو نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کیوں اولی الامر یعنی بادشاہوں کی اطاعت کا حکم دیتا۔ غرض یہ بات نہایت صاف ہے بادشاہوں کی اطاعت کا حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی دین کا ہی حصہ رکھا ہے اور باوجود سیاست کو دین کا حصہ رکھنے کے پھر بھی حکم دیا ہے کہ بادشاہوں کی اطاعت کرو۔ اور پھر کا یشرک فی حکمہ احدا میں کوئی قید امور دینی کی نہیں ہے۔ پس جس طرح امور سیاسی میں بادشاہوں کی اطاعت شرک فی الحکم نہیں اسی طرح کسی امر میں انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں دوسرے کو شریک کر دیا۔ نہیں بلکہ ہم تو اللہ کے حکم کے ماتحت ہی اس کا حکم مانتے ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ حکم تو پھر بھی صرف خدا کا ہی رہا۔ اور کوئی شخص شریک فی الحکم نہ ہوا۔

حکم کے ماتحت حکم

اس کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے افغیر اللہ ابتغی حکما کیا میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا حکم چاہوں یعنی فیصلہ کرنے والا۔ لیکن دوسری جگہ خود ہی فرماتا ہے کہ میاں بیوی میں جھگڑے کے وقت یوں کیا کرو۔ فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا ایک حکم مرد کے گھر والوں سے اور ایک حکم عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو۔ اب اشتراک لفظی کو دیکھیئے۔ ایک طرف حکم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو حکم بنانا جائز نہیں دوسری طرف ایک معمولی خانگی جھگڑے میں حکم ہوتا ہے کہ دو حکم مقرر کر لو۔ اگر وہی طریق استدلال ہے جو ہمارے اہل قرآن کہلانے والے دوست اختیار کرتے ہیں کہ جب حکم اللہ کے لئے خاص ہے تو کسی اور کو حکم ماننا شرک ہے تو اللہ کے سوائے دوسرے کو حکم بنانے کی تعلیم دیکر پھر کیا قرآن نے خود شرک سکھایا؟ حکم وہ بھی ہیں مگر اصل حکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فیصلہ ان کا بھی بالضرور قبول کرنا ہوگا اسی لئے ان کو حکم کہا ہے مگر چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت حکم بنتے ہیں۔ اس لئے یہ شرک نہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ ان کو کیوں حکم کہا اور حاکم نہیں کہا تنبیھاً ان من شرط الحکمین ان یتولیا الحکم علیھم یعنی یہ بتانے کے لئے کہ حکم کی شرط یہ ہے کہ وہ ان پر حکم کا متولی ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے فیصلہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم ہی کہا ہے وداؤد وسلیمان اذ یحکمٰن فی الحرث اذ نفشت فیہ غنم القوم وکنا لحکمھم شاھدین ففھمنٰھا سلیمان وکلا اٰتینا حکما وعلما اور داؤد اور سلیمان جب کھیتی کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے جب رات کے وقت اس میں لوگوں کی بکریاں جا پڑیں اور ہم ان کے حکم کے گواہ تھے پس ہم نے سلیمان کو سمجھا دیا اور دونوں کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا اب ان الحکم الا للہ بھی درست ہے یعنی حکم اللہ کے سوائے کسی کا نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ

داؤد اور سلیمان دونوں کو حکم یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا تھا خواہ وہ کسی معاملہ میں ہو مگر حکم ہی تھا۔ یہ بھی شرک نہیں۔ کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ پس معلوم ہؤا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا حکم دینا خلاف منشائے قرآن کریم بلکہ عین اس کے منشاء کے مطابق ہے۔ اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا حکم بننا بھی خلاف منشائے قرآن کریم نہیں۔

قرآن میں اطاعت رسول کا ذکر

اب جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ خود کسی دوسرے کا حکم ماننے کا حکم دے تو وہ لا یشرک فی حکمه أحدا۔ اور ان الحکم الا للہ کے خلاف نہیں۔ تو ہم ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یا آپ کے حکم ماننے کا یا آپ کو حکم بنانے کا حکم دیا ہے۔ ایسی کسی آیت کے خلاف اب یہ دلیل پیش نہ ہو سکیگی کہ اس آیت کے ایسے معنی کرنا خلاف قرآن ہے۔ کیونکہ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت دوسرے کے حکم کے ماننے کو جائز رکھتا ہے قرآن شریف میں ایسی آیات جن میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا کھلے الفاظ میں ذکر ہے بیس ہیں۔ اور مختلف الفاظ میں یہ ذکر موجود ہے۔ پہلے میں ان آیات کو لکھ دیتا ہوں۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء۔ ۸۰) ومن یطع اللہ والرسول (النساء۔ ۶۹) ومن یطع اللہ ورسولہ (النساء ۱۳۔ النور۔ ۵۲۔ الاحزاب۔ ۳۳۔ الفتح ۱۷) ویطیعون اللہ ورسولہ (التوبۃ ۷۲) وان تطیعوا اللہ ورسولہ (الحجرات ۱۴) قل اطیعوا اللہ والرسول (آل عمران۔ ۳۲) یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (النساء ۵۹۔ محمد ۳۳) یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ (الانفال ۲۰) قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (النور۔ ۵۴) واطیعوا اللہ والرسول (آل عمران۔ ۱۳۱) واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (المائدہ۔ ۹۲۔ تغابن۔ ۱۲) واطیعوا اللہ ورسولہ (الانفال ۱۔ ۴۶۔ المجادلہ۔ ۱۳) واطیعوا الرسول (النور۔ ۵۶) اور بارہ آیات ایسی ہیں جن میں دوسرے انبیاء نے اپنے اپنے وقت میں اپنی امتوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلایا ہے اور وہ الفاظ عموماً ایک ہی ہیں یعنی فاتقوا اللہ واطیعون۔ جو حضرت عیسیٰ کے متعلق آل عمران ۴۹۔ اور الزخرف ۶۳ میں۔ اور حضرت نوح کے متعلق الشعراء۔ ۱۰۸ و ۱۱۰۔ اور نوح۔ ۳ (یہاں فاتقوا اللہ کی جگہ فاتقوہ ہے) میں اور حضرت ہود کے متعلق الشعراء۔ ۱۲۶۔ ۱۳۱ میں اور حضرت صالح کے متعلق الشعراء ۱۴۴۔ ۱۵۰ میں اور حضرت لوط کے متعلق الشعراء۔ ۱۶۳ میں۔ اور حضرت شعیب کے متعلق الشعراء۔ ۱۷۹ میں اور حضرت ہارون کے متعلق طہٰ۔ ۹۰ میں یہ لفظ ہیں ولقد قال لھم ھارون من قبل ...... فاتبعونی واطیعوا امری۔ اور ہارون نے انہیں پہلے سے کہہ دیا تھا ...... سو تم میری پیروی کرو

اور میرے حکم کی فرمانبرداری کرو۔ اور ایک مرتبہ کل رسولوں کے متعلق عام قاعدہ بتا دیا وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء۔ ۶۴) یعنی ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی طرح نبی کریم صلعم کو حکم بنانے کا حکم بھی موجود ہے فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء۔ ۶۵) نہیں میرے رب کی قسم ہرگز ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ تم کو حکم بنائیں اس میں جو ان میں جھگڑا ہو پھر اپنے دلوں میں اس کے بارہ میں کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور کامل فرمانبرداری سے قبول کریں۔ آپ کا حکم ماننے کے متعلق اور بھی آیات ہیں جیسے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران۔ ۳۰) کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب۔ ۲۱) تمہارے لئے اللہ کے رسول میں نہایت عمدہ نمونہ ہے یعنی آپ کے نقش قدم پر چلو۔ بالفعل میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ ان آیات میں کافی سے زیادہ وضاحت موجود ہے۔

مولوی عبداللہ کی اطاعت رسول کی تفسیر

بظاہر یہ اس قدر قوی اور صریح ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہے کہ اس قدر متواتر احکام کی موجودگی میں کسی شخص کا آپ کی اطاعت سے انکار کرنا خود انکار قرآن مجید ہے۔ مگر اہل قرآن کہلانے والے لوگ اس قدر صریح آیات قرآنی کا انکار کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ ان کے انکار کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔ اوّل "سارے قرآن مجید میں جس جگہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول آوے وہاں سب جگہ مراد صرف کتاب اللہ المجید ہی ہوتی ہے"۔ کیونکہ لغت عرب میں رسول بمعنی رسالت بھی آیا ہے۔ اور چونکہ ان الحکم الا للہ اور لا یشرک فی حکمہ احدا کے ماتحت کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے اس لئے اطیعوا الرسول میں الرسول سے مراد رسالت ہے اور رسالت سے مراد قرآن مجید ہے۔ دوئم جہاں لفظ اطیعون آیا ہے۔ اور جہاں لیطاع باذن اللہ ہے وہاں مراد اطاعت سے موافقت ہے۔ کیونکہ اطاعت کے معنی لغت عرب میں موافقت بھی آئے ہیں۔ پس فاتقوا اللہ واطیعون کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کا تقویٰ کرو یعنی میرے خیال کی موافقت کرو یعنی جس طرح میں اللہ سے ڈرتا ہوں اسی طرح تم ڈرو۔ سوئم واطیعوا امری میں۔ امر سے مراد حکم نہیں بلکہ حال و عمل و چال چلن معنی ہیں۔ پس فاتبعونی واطیعوا امری کے معنی ہوئے سو تم میری پیروی کرو یعنی میرے چال چلن میں میرے ساتھ موافقت کرو۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ لفظ رسول اور اطاعت اور امر کا اور حرف عطف وٓ کا مفہوم مولوی

عبداللہ صاحب وہ نہیں لیتے جو مفسرین قرآن نے عام طور پر لیا ہے بلکہ ان کے معنی کچھ اور لیتے ہیں۔ اور اس تمام اختلاف معنی کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ قرآن شریف میں چونکہ لا یشرک فی حکمہ احدا اور ان الحکم الا للہ آیا ہے اس لئے کسی دوسرے کا حکم مانا نہیں جا سکتا۔ بلکہ کسی دوسرے کا حکم دینا یا اس کا ماننا دونوں شرک ہیں پس جب حکم نہیں تو فرمانبرداری کیسی لیکن چونکہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ خدا کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کا حکم دینا ان الحکم الا للہ اور لا یشرک فی حکمہ احدا کے خلاف نہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے خود لفظ حکم۔ اور حکم استعمال کر کے دکھا دیا پس مولوی صاحب کے ظاہر معنی سے انحراف کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ تاویلات بعیدہ ورکیکہ کو کام میں لانے کی کوئی گنجائش ہے۔ جب قرآن شریف دوسرے کے حکم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت جائز رکھتا ہے۔ تو اصل میں جس بات سے غلط فہمی پیدا ہوئی تھی وہ دور ہو گئی اور ان آیات کے ظاہر معنی کی رو سے رسول اللہ صلعم کی اطاعت ضروری ٹھہری اور مولوی عبداللہ صاحب کی ساری بحث کا فیصلہ اس ایک بات پر ہی ہو جاتا ہے۔

واؤ کی تفسیر مبہم سے

لیکن میں مولوی صاحب کے معنی کو لیکر دکھاتا ہوں کہ یہ معنی خود ہی کسی طرح پر قابل قبول نہیں۔ اوپر کے قریباً تیس مقامات میں مولوی عبداللہ صاحب نے واؤ کو تفسیری ٹھہرا کر معنی کئے ہیں مولوی صاحب کے نزدیک جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے یطع اللہ و رسولہ۔ یطیعون اللہ و رسولہ۔ اطیعوا اللہ و رسولہ یا اس قسم کے لفظ فرمائے ہیں وہاں اللہ کی اطاعت کی تفسیر رسولہ سے کر کے یہ بتایا کہ اللہ کی اطاعت سے اس کے رسول یعنی اس کے پیغام یعنی قرآن شریف کی اطاعت مراد ہے۔ اول سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کی اطاعت کوئی ایسا مبہم امر تھا کہ اس کی تفسیر کی ضرورت پیش آئی اللہ کی اطاعت ایک ایسا صاف اور سیدھا جملہ ہے کہ موٹی سے موٹی عقل کے انسان کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نظر نہیں آتی۔ کسی کی اطاعت یہ ہے کہ جو وہ حکم دے وہ مان لیا جائے جس امر کی تفسیر کی ضرورت نہ ہو اس کی تفسیر قرآن شریف کرنے لگے یہ عجیب معاملہ ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن شریف اب ساری لغت کو بھی خود بیان کرے۔ کوئی شخص جس کے دل میں قرآن کی عظمت ہے اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ ایک جملہ جس کے معنی سمجھنے میں کسی کو دقت نظر نہیں آتی اس کی تفسیر خود قرآن شریف کرے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ تفسیر تو ایک آدھ دفعہ کر دینا کافی تھا اس کے کیا معنی کہ جب اطیعوا اللہ کا حکم دیا۔ ساتھ ہی تفسیر بھی شروع کر دی۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ایسا گول مول فقرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر نہ کرتا تو شاید لوگ اس کے کچھ کے کچھ معنی سمجھ لیتے اس لئے

ایک دو دفعہ تفسیر کر دینا کافی نہیں سمجھا بلکہ برابر سالوں تک جب أطیعوا اللہ کا حکم دیا ساتھ ہی اس کی تفسیر شروع کر دی۔ کیا اس کی کوئی اور مثال بھی قرآن شریف میں ہے کہ بار بار جب ایک حکم دیا جائے تو ساتھ ہی اس کی تفسیر بھی بتا دی جائے اور کبھی بھی اس کو بغیر تفسیر کے بیان نہ کیا جائے تیسرا سوال یہ ہے کہ تفسیر ہمیشہ ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو پہلے لفظ کے ابہام کو دور کر دے اور ابہام کو دور کرنے کا نام ہی تفسیر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بقول مولوی عبد اللہ صاحب اللہ کی اطاعت کا مفہوم مبہم ہے اور رسول کی اطاعت کے لفظ نے اسے واضح کر دیا۔ گویا اللہ کے لفظ میں ابہام ہے ......

.... اور رسول کے لفظ میں نہ صرف کوئی ابہام نہیں بلکہ وہ اس قدر واضح ہے کہ جو ابہام اللہ کے لفظ میں تھا اس نے اسے بھی دور کر دیا۔ اور دوسری طرف مولوی صاحب کی ساری بحث کا دارومدار اس بات پر ہے کہ لفظ رسول کے دو معنی لغت عرب میں آتے ہیں یعنی ایک پیغامبر دوسرے پیغام۔ تو جس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں یقیناً اس میں ابہام ہے۔ اس کے خلاف اللہ کے دو معنی آج تک روئے زمین پر کسی نے کئے نہیں۔ اب شاید اہل قرآن میں سے کوئی اپنے پیش رو کی عزت بچانے کے لئے کر دے تو کر دے تو پس یوں کہنا چاہیئے کہ لفظ اللہ کی تفسیر جس کے معنی ایک کے سوا دوسرے ہو ہی نہیں سکتے اور نہ کبھی کسی نے فرضی طور پر بھی کئے ہیں۔ قرآن شریف نے جسے پر حکمت کتاب ہونے کا دعویٰ ہے ایک ایسے لفظ سے کی ہے جس کے معنی میں اتنا بڑا ابہام ہے کہ تیرہ سو سال تک سارے مفسرین اور سارے کے سارے علماء و لغت دان اس کے غلط معنی مراد لیتے رہے۔ اور تیرہ سو سال میں اس اُمت میں سے ایک شخص کو بھی صحیح معنی معلوم نہ ہوئے۔

اگر کوئی غور کرے تو یہ ایک بات ہی ساری بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے متعلق ایک جگہ تو مولوی عبد اللہ صاحب نے کمال ہی کر دیا ایک جگہ قرآن شریف میں آتا ہے واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول (النساء - ۶۱) اور جب ان کو (یعنی منافقوں کو) کہا جاتا ہے آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف۔ مولوی صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں "جب کہا جاتا ہے ان کو آؤ اس کتاب اللہ کی طرف جو اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے یعنی اس کے بھیجے ہوئے قرآن مجید کی طرف"۔ گویا ما انزل اللہ سے تو ان کو پتہ نہ لگتا تھا کہ خدا تعالیٰ کس چیز کی طرف بلاتا ہے لیکن الرسول سے اس کی تفسیر ہو گئی۔ کوئی خدا کے لئے غور کرے کہ یہ کیا ہنسی قرآن شریف کے ساتھ ہو رہی ہے کہ ما انزل اللہ ایسے صاف واضح لفظ کی بھی تفسیر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور بہر حال

ضرورت پیش آئی تھی تو کوئی اس سے بھی زیادہ واضح جملہ بولا جاتا مگر ما انزل اللہ کی تفسیر جس کے معنی ساری اُمت محمدیہ میں مولوی عبد اللہ صاحب کے ہم خیالوں سمیت مسلّم طور پر ایک ہی ہیں۔ اور ایک ہی ہمیشہ رہے ہیں۔ الرسول سے کی جاتی ہے جس کے معنی میں بقول مولوی صاحب ابہام ہے اُلٹے عقیدہ کے ماتحت انسان کے دماغ میں خیال بھی اُلٹے آنے لگتے ہیں۔ واضح ترین اور روشن ترین ایک ہی معنے کے لفظ کی تشریح مبہم اور ذومعنی الفاظ سے کرنا انہیں اُلٹے خیالات کا نتیجہ ہے۔

مگر ہم اس تفسیری و کے کمالات کو ذرا اور غور سے دیکھتے ہیں اطیعوا اللہ و رسولہ میں تو اللہ کی تفسیر لفظ رسول سے ہوتی ہے۔ اور فاتقوا اللہ و اطیعون میں ایک جملہ فاتقوا اللہ یعنی اللہ کا تقویٰ کرو کی تفسیر دوسرے جملہ اطیعون سے ہوتی ہے یعنی میری اطاعت کرو یا بقول مولوی صاحب میری موافقت کرو یعنی جس طرح میں تقویٰ کرتا ہوں اسی طرح تم تقویٰ کرو۔ یہاں بھی وہی صورت ہے اتقوا اللہ کے معنی تو ایک ہی ہیں کیونکہ اس جملہ کے دونوں لفظ یعنی اتقا اور اللہ ایک ایک معنی کے ہی متحمل ہیں لیکن اطاعت کے پھر دو معنی ہیں۔ ایک حکم کا ماننا دوسرے بقول مولوی صاحب چال چلن میں موافقت اختیار کرنا۔ یہاں پھر واضح لفظ کی تفسیر مبہم سے ہوئی۔ کیونکہ ایک معنی والے لفظ کے مقابل میں دو معنی والے لفظ میں کچھ نہ کچھ ابہام ضرور ہے۔ تیسرا جملہ اس قسم کا فاتبعونی و اطیعوا امری ہے۔ یہاں بھی و تفسیری بتائی جاتی ہے گویا فاتبعونی کے معنی میں کچھ اختلاف تھا اس کو واضح کر دیا کہ اس سے مراد ہے اطیعوا امری۔ مگر اصل یہ ہے کہ فاتبعونی کے معنی میں تو جملہ مفسرین کے ساتھ مولوی عبد اللہ صاحب کو کوئی اختلاف نہیں۔ اور اطیعوا امری میں اختلاف ہے جملہ مفسرین اطیعوا امری کے معنی کرتے ہیں میرے حکم کی فرمانبرداری کرو مگر مولوی عبد اللہ صاحب اس کے معنی کرتے ہیں میرے چال چلن میں میری موافقت کرو۔ پھر وہی قضیہ درپیش ہے کہ جس لفظ کے معنی میں کچھ اختلاف نہیں اس کی تفسیر ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جس کے معنی میں اختلاف ہے۔ اگر مولوی عبد اللہ صاحب یہ ثابت کر دیتے کہ اطیعوا کے وہ معنی ہی از روئے لغت غلط ہیں جو عام مفسرین کرتے آئے ہیں تو ان کی بات بے شک قابل قبول ہوتی مگر جب وہ معنی بھی صحیح ہیں اور مولوی عبد اللہ صاحب والے بھی صحیح ہیں تو بہر حال معنی میں ابہام ہوا۔ گویا تینوں مثالوں میں یعنی اطیعوا اللہ والرسول میں۔ فاتقوا اللہ و اطیعون میں فاتبعونی و اطیعوا امری میں تین واضح المعنی الفاظ اللہ۔ اتقاء اللہ اور اتباع کی تفسیر تین مبہم الفاظ الرسول۔ اطیعونی۔ اور اطیعوا امری سے کی گئی ہے۔ ایسے لفظ کی تفسیر جس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ ہو ایسے لفظ سے کرنا جس کے معنی میں اختلاف اور ابہام ہے کسی عقلمند کا کام نہیں۔

تفسیری واؤ

لیکن آؤ ذرا اس واؤ تفسیری پر غور کریں جس نے اتنا بڑا انقلاب دنیا میں پیدا کر دیا کہ ایک اس کی مہربانی سے تمام مجموعہ احادیث تمام اقوال و افعال نبوی نعوذ باللہ ایک ہزلیات کا مجموعہ بن گیا اور تیرہ سو سال کے سارے علوم اسلامی جو پاکیزہ سے پاکیزہ قلوب سے نکلے اور جن پر بہترین سے بہترین دماغ لگے رہے وہ تمام باطل ہو گئے۔ یہ کیسی تفسیری واؤ تھی اور تمام ائمہ و محدثین و علماء و ملہمین ربانی کی آنکھوں سے کس طرح یکسر چھپی رہی۔ اور کیا ائمہ لغت اور ائمہ صرف و نحو کو بھی اس کا کوئی علم ہوا تھا یا نہیں یا وہ بھی اس سے بے خبر رہے۔ واؤ عطف کیلئے آتی ہے۔ اس عطف کے اقسام لکھتے ہوئے مغنی اللبیب میں لکھا ہے کہ ایک عطف کسی شے کا اپنے ہم معنی پر ہوتا ہے۔ والثالث عشر عطف الشئ علی مرادفہ اور اس کی مثالیں دی ہیں انما اشکو بثی و حزنی الی اللہ۔ اولئک علیھم صلوٰت من ربھم و رحمۃ ط لا تریٰ فیھا عوجا و لا امتا۔ یہاں گویا لفظ بث اور حزن۔ صلوات اور رحمۃ۔ عوجا اور امتا مرادف یعنی ہم معنی لفظ ہیں تو گویا یہ جائز ہے کہ ایک لفظ پر دوسرے ہم معنی لفظ کو مزید تاکید کیلئے عطف کر دیا جائے۔ اب اطیعوا اللہ والرسول میں الرسول کا عطف اللہ پر ہے تو کیا اللہ اور الرسول دو مرادف لفظ ہیں؟ والرسول کے دونوں معنی میں سے جو چاہو لے لو، یا فاتقوا اللہ و اطیعون میں آیا اتقوا اللہ اور اطیعون دو مرادف جملے ہیں۔ پس یہ تفسیری واؤ زبردستی کی بنائی گئی ہے۔ مرادف یعنی ہم معنی لفظ ایک دوسرے پر عطف ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ اور اس کی رسالت ہم معنی لفظ نہیں ہیں۔ پس یہ بنیاد جس پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ خود غلط ہے۔ اور جو عمارت اس پر کھڑی ہوئی ہے اس کا حال پہلے واضح ہو چکا واؤ تفسیری جس پر مولوی عبداللہ اور ان کے ہم خیالوں کی ساری بحث کا دار و مدار ہے خود ان کی تجویز کردہ ہے۔ ائمہ لغت و ائمہ نحو کو اس کا کوئی علم نہیں ؏

وحی خفی کا ذکر قرآن شریف میں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حدیث کو وحی خفی نہیں کہنا چاہیئے۔ حالانکہ اس وحی کا ذکر خود قرآن شریف کرتا ہے۔ کیونکہ جب یہ فرمایا کہ ان علینا بیانہٗ تو جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل کے بارہ میں فرمایا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف ہی منسوب کیا جس طرح جمع قرآن کو اپنی طرف منسوب کیا حالانکہ کوئی وحی آپ پر ایسی تو نازل نہ ہوئی تھی کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ رکھو اور فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھو۔ پس آپکا ترتیب سور و آیات دینا بھی خدا کی طرف سے تھا۔ اور بیان مسائل بھی خدا کی طرف سے تھا لیکن چونکہ یہ وحی متلو کے ذریعہ سے نہیں ہوا اس لئے اسے وحی خفی کہا جاتا ہے ؏

قرآن شریف میں نماز کا حکم کب نازل ہوا؟ ظاہر ہے کہ نہایت ابتدائی سورتوں میں یہ حکم پایا

قرآن شریف میں نماز اور وضو کے ذکر سے وحی خفی پر کھلا استدلال

جاتا ہے۔ سورۂ اقراء میں۔ سورۂ مزمل میں۔ اور دوسری ابتدائی سورتوں میں اور تاریخ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے۔ پس اگر نماز کی تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت تھی اور نبی کریم صلعم وحی خفی کے ذریعہ سے اُن تفصیلات کے بتانے کے مجاز نہ تھے تو چاہیئے تھا کہ ان تمام تفصیلات کے جو نماز کے متعلق قرآن شریف میں بتائی جاتی ہیں نازل ہونے کے بعد نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا اور ایسا ہی وضو کی تفصیل بھی پہلے نازل ہو لیتی۔ لیکن جو شخص مولوی عبداللہ صاحب کی تشریحات کو پڑھے گا وہ صاف دیکھ سکتا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب نے ان آیات سے نماز کی تفصیلات کا استدلال کیا ہے جو نماز کے حکم کے مدتوں بعد نازل ہوئیں اور ایسا ہی آج مولوی صاحب کے مرید کرتے ہیں۔ یہ عجیب تفصیل ہے کہ حکم تو نماز پڑھنے کا پہلے دے دیا اور تفصیلات سالہا سال بعد بیان کیں کیا کوئی عقلمند اس کو قبول کر سکتا ہے یا خدا کی طرف ایسی بات منسوب کر سکتا ہے۔ ہاں یوں کہنا چاہیئے کہ جب قرآن کریم نے بعد میں نازل ہو کر نماز کے اوقات وغیرہ کا بھی بعض حالات میں ذکر کر دیا تو گویا جو کچھ نبی کریم صلعم نے وحی خفی سے اوقات یا ارکان مقرر فرمائے تھے ان کی صحت کو تسلیم کر لیا۔

ایسا ہی وضو کی تفصیل کہ نماز سے پیشتر منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھوؤ۔ اور سر کا مسح کرو سورہ مائدہ میں ہے جو بہت پچھلے زمانہ میں مدینہ میں آکر نازل ہوئی حالانکہ وضو تو شروع سے کیا جاتا تھا۔ اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ جو صورت وضو کی نبی کریم صلعم نے بتائی تھی۔ وہی درست ہے اور وحی متلو کا اس کو اپنے اندر لے لینا بتاتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے وضو اپنی رائے سے مقرر نہ کیا تھا بلکہ وحی خفی سے وضو کو ضروری ٹھہرایا اور وحی خفی سے ہی اس کی تفصیلات بتائیں یہ وحی خفی پر قرآن کریم سے ایسا کھلا استدلال ہے جس کو مسلمان کہلا کر کوئی شخص رد نہیں کر سکتا۔

وحی کے تین رنگ

خود بشر کے ساتھ وحی کے تین رنگوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے دما کان لبشران یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء (الشوریٰ۔۵۱) اور نہیں شایان کسی بشر کو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے پس اپنے اذن سے جو چاہے وحی کرے۔ یہاں خاص بشر کے ساتھ کلام کرنے کا ذکر ہے اس لئے وہ لوگ اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جن کی طرف رسول بھیجے جاتے ہیں مگر خود ان کے ساتھ کلام نہیں ہوتا جیسا کہ ان کا اپنا قول قرآن شریف میں منقول ہے لولا یکلمنا اللہ۔ اللہ ہمارے ساتھ کیوں کلام نہیں کرتا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے یہاں پر غلطی کھائی ہے اور جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے اُن کے ساتھ بھی خدا کا کلام کرنا مانا ہے حالانکہ قرآن شریف اس کا انکار

کرتا ہے پس یہاں خاص بشر کے ساتھ کلام کا ذکر ہے اور اس کی تین طرزیں بتائیں سب سے اول خود لفظ وحی کو رکھا ہے جس کے اصل معنی ہیں اشارہ سریعہ یعنی تیز اشارہ اور یہ کسی بات کے دل میں ڈالنے کا نام ہے جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے القاء فی الروع پس یہ بھی ایک طرز کلام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کے دل میں ایک بات ڈال دے اس کے مقابل پر شیطانوں کے اپنے ساتھیوں کو وحی کرنے کا ذکر ہے ان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم شیطان اپنے ساتھیوں کی طرف وحی کرتے ہیں حالانکہ شیطان بھی الفاظ کی وحی نہیں کرتے بلکہ دل میں ایک بات ڈالتے ہیں الذی یوسوس فی صدور الناس سو دل میں ڈالنا ہی وحی خفی ہے۔ کیونکہ بمقابلہ الفاظ والی وحی کے اس کا رنگ مخفی ہے۔ دوسرا طریق کلام کا اللہ تعالیٰ نے من وراء حجاب فرمایا ہے جیسا کہ رویا میں ہوتا ہے۔ کیونکہ رویا میں ایک پردہ ہوتا ہے اور وہ تعبیر طلب ہوتی ہے۔ ایسا ہی وہ کلام یا آواز جو انسان سنتا ہے یا وہ الفاظ جو اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں جس پر تمام اولیائے اُمت کی متفقہ شہادت ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق اللہ نے اپنے رسول کو رؤیا سچ دکھایا تھا اور گو اصل رویا کو قرآن شریف میں بیان نہیں کیا مگر اس کی تعبیر کو بیان کیا ہے لتدخلن المسجد الحرام تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے یعنی وہ خواب اس طرح پورا ہو کر رہے گا۔ پس رؤیا اور الہام بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کی ایک قسم ہے جس کو من وراء حجاب کہا ہے تیسری قسم وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے جس میں اللہ تعالیٰ ملک رسول یعنی جبرائیل کو بھیجتا ہے نزلہ روح القدس علی قلبك اور دوسری جگہ ہے قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبك باذن اللہ کہو جو شخص جبریل کا دشمن ہے تو اسی (جبریل) نے اسے (یعنی قرآن کو) تیرے دل پر اتارا اللہ کے اذن سے۔ یہاں انہ کی ضمیر جبریل کی طرف ہی جاتی ہے جو قریب تر ہے اور باذن اللہ میں اللہ کا لفظ صراحتًا لانا بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ ورنہ صورت عبارت یوں ہونی چاہیے تھی فان اللہ نزلہ علی قلبك باذنہ پس قسم اول جس کو صرف وحی کہا ہے وہ درحقیقت وحی خفی ہے جس میں صرف دل میں ایک بات ڈالی جاتی ہے۔

وحی خفی پر دو اعتراض اوّل آنحضرت سے وقوع سہو یا غلطی

یہاں پر دو سوال کئے جاتے ہیں ایک یہ کہ اگر وحی خفی کوئی چیز ہے تو باوجود وحی خفی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی موقعہ پر سہو یا نسیان یا غلطی کیوں ہوئی۔ اور دوسرے یہ کہ پھر اس وحی خفی کو کامل طور پر محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام اللہ تعالیٰ نے کیوں نہ کیا جیسا کہ قرآن کریم کی حفاظت کا انتظام کیا ان دونوں سوالوں کا جواب یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وحی متلو اور وحی خفی کے مرتبہ میں فرق

دکھانے کے لئے ایسا کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو وغیرہ بھی اُمت کی تعلیم کے لئے تھا لیکن کسی مسئلہ کے بیان کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی غلطی نہیں لگی۔ البتہ بعض دوسری باتوں میں غلطی لگی کیونکہ آخر آپ بشر تھے۔ اور بتقاضائے بشریت کسی وقت غلطی لگ جانا یا سہو ہو جانا نبوت کا منافی نہیں۔ ہاں اگر آپ مسائل غلط بیان کرنا شروع کر دیں جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب کا خیال ہے تو پھر تو شریعت سے امن اُٹھ جاتا ہے اور جن مواقع پر آپ کو غلطی لگی یا سہو ہؤا اس میں بھی درحقیقت اُمت کی تعلیم ہے اور بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک رؤیا کی تعبیر میں غلطی لگی جیسا کہ ابھی حدیبیہ والا رؤیا بیان ہؤا حالانکہ رؤیا سچ تھا مگر رؤیا میں یہ نہ تھا کہ اس سال آپ حج کریں گے واپس ہونا پڑا مگر اس سے تو اس قدر نیک نتائج پیدا ہوئے کہ جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ مجملاً دیکھئے یہ صلح فتح مبین ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوئے چنانچہ صلح حدیبیہ کے وقت آپ کے ساتھ تیرہ سو یا پندرہ سو آدمی ہیں۔ ڈیڑھ سال بعد فتح مکہ کے وقت دس ہزار ہیں پھر صلح کرا کر یہ بتا دیا کہ یہ اسلام کا حکم نہیں کہ جبتک سب مسلمان نہ ہوں جنگ کرتے جاؤ اگر ایسا حکم ہوتا تو نبی کریم صلعم کفار کے ساتھ کبھی صلح نہ کرتے۔ پھر شرائط صلح میں یہ شرط لکھی گئی کہ مسلمانوں میں سے کوئی کفار کے ساتھ جا ملے تو اسے واپس نہیں کرینگے اور کوئی کافر مسلمان ہو کر آنحضرت کے پاس آئے تو آپ اسے واپس کر دینگے اب مسلمانوں میں سے ایک کا بھی کفار کے ساتھ جا ملنا ثابت نہیں جس سے معلوم ہؤا کہ وہ بزور شمشیر مسلمان نہ ہوئے تھے ورنہ سب کے سب فوراً کفار کے ساتھ جا ملتے اور کفار قریش میں سے جو لوگ مدینہ میں آنحضرت صلعم کے پاس آئے آپ نے انہیں واپس کیا اور یوں پابندی معاہدہ کرکے سبق دیا پھر جو لوگ واپس ہوئے وہ اس قدر اخلاص اسلام کے ساتھ رکھتے تھے کہ مکہ واپس نہیں گئے۔ بلکہ الگ جا کر اپنی ایک آبادی بنالی جہاں آہستہ آہستہ ایک خاصی جماعت بن گئی اس سے معلوم ہؤا کہ اسلام کی کشش کس قدر غالب تھی کہ حالانکہ مسلمان بھی اپنے ساتھ نہیں ملاتے تھے پھر بھی کفار میں واپس نہیں گئے۔ اس نے دو باتوں پر مہر لگا دی اوّل ان کے دلوں میں دنیوی لالچ ذرہ بھر نہ تھا۔ دوم ان کا اخلاص ایک پہاڑ کی طرح تھا جس کو کوئی دکھ اور فتنہ جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ پس یہ غلطی بھی اُمت کے لئے بہت سے فوائد کا موجب ہوئی۔ یا مثلاً آپ نے ایک موقعہ پر اپنی کسی بیوی کی خوشی کے لئے کسی چیز کو ترک کر دیا تو یہ کوئی مسئلہ نہیں جو غلط بیان کر دیا ہو بلکہ آپ نے اپنی ذات کے لئے ایک چیز کو جس سے آپ کو محبت بھی تھی ترک کر دیا اور یہ حسن معاشرت میں ایک سبق تھا۔ با ایں یہ درست نہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس غلطی پر متنبہ کر دیا۔ یہ غلطی کرا کر متنبہ کرنا اس لئے تھا کہ تا اُمت کو یہ بات ذہن نشین

ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو ارادۃً ترک کر دینا درست نہیں۔ یا مثلاً ایک نابینا کے اس وقت آنے پر جب آپ بعض کفار کو سمجھا رہے تھے۔ اور اس کے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر آپ کی پیشانی پر بل آجانا حالانکہ محض ایک تقاضائے بشریت ہے اور نابینا پیشانی کے بل کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر چونکہ آپ کو اعلیٰ اخلاق پر قائم کرنا اور آپ کی اُمت کو ایک سبق دینا تھا اس لئے فرمایا عبس وتولی ان جاءہ الاعمیٰ تو گویہ نہایت ہلکی فروگذاشت تھی مگر یہ بھی اس لئے ہوئی کہ تا مخالفوں پر اتمام حجت ہو کہ یہ وحی رسول کے دل سے پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اگر خود بنانے والا ہوتا تو اپنی کمزوری کی تشہیر کیوں دنیا میں کرتا۔ غرض وہ تمام امور جن میں آپ سے فروگذاشت یا سہو ہوا وہ مسائل دینی کے بیان کرنے میں تو ہرگز نہیں ہوا اور وحی خفی کی روشنی مسائل کے بیان کرنے سے ہی مخصوص ہے جیسا کہ شان علینا بیانہ سے ثابت ہے۔ البتہ ان فروگذاشتوں اور سہو سے بڑی عظیم الشان باتیں اخذ ہوتی ہیں۔

دوم وحی خفی کی حفاظت قرآن شریف کی طرح کیوں نہ ہوئی

رہا یہ سوال کہ حدیث اس طرح پر محفوظ کیوں نہ رہی جس طرح قرآن شریف۔ میں پوچھتا ہوں کہ توریت و انجیل اور اور کتب منزلہ اس طرح پر کیوں محفوظ نہ رہیں جس طرح پر قرآن شریف محفوظ رہا۔ حالانکہ وہ تو وحی متلو تھی۔ مثلاً انجیل حضرت عیسیٰ سے تھوڑی دیر بعد ہی محرف نظر آتی ہو حالانکہ اس پر عملدرآمد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ضروری تھا۔ اور اب بھی وہ محرف نہ ہوتی تو عیسائیوں پر اتمام حجت کیسا آسان ہوتا لیکن میں اگلے مضمون میں دکھاؤں گا کہ حدیث کی حفاظت کے سامان اللہ تعالیٰ نے کس قدر رکھے اور وحی خفی ہونے کے باوجود وہ توراۃ و انجیل سے جو وحی متلو ہیں بہت زیادہ محفوظ ہے۔

چوتھا باب

جمع حدیث

جمع حدیث پر اعتراض

ضرورت حدیث کے مضمون کو بیان کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ ہماری راہ میں یہ ہے کہ آیا اس وقت سے پہلے جب محدثین نے احادیث کو کتابوں میں مدون کیا کوئی سامان حفاظت حدیث کا تھا یا نہیں؟ کیونکہ خواہ محدثین نے کتنا بھی نیک نیتی سے کام لیا ہو۔ جس کا اعتراف بیرونی اور اندرونی معترضین کو یکساں ہے۔ تاہم ان کی نیک نیتی اور ان کی محنت کسی بڑے مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی اگر ابتدائی ایک ڈیڑھ سو سال میں حدیث کی حفاظت نہ کی گئی ہو۔ بیرونی معترضین کا تو یہ خیال ہے کہ حدیث کی ضرورت ابتدائی زمانہ اسلام میں نہ تھی۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا خلیفہ خلیفہ اوّل اور اوائل زمانہ خلیفہ ثانی میں۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی ضروریات کا دائرہ نہایت محدود تھا اور فتوحات اسلامی کے ساتھ اور سلطنت کی وسعت کے ساتھ یہ ضرورت پیش آئی اور حدیثیں بنانی شروع کی گئیں۔ اور اندرونی معترضین کہتے ہیں کہ زمانہ نبوی اور زمانہ صحابہ و تابعین وغیرہ میں حدیث کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

زمانہ نبوی میں ضرورت حدیث

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث کی ضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی یا نہیں؟ جو شخص کچھ بھی تاریخ اسلامی پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلامی کی بنیاد ابتدا سے ہی اولاً قرآن کریم پر اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل پر رکھی گئی مثلاً قرآن کریم ابتدا میں ہی مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم نماز پڑھو لیکن نماز کس طرح پڑھنی چاہیے اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن شریف نے نہیں بتائی۔ اور اگر بعد میں کبھی نماز کے بعض ارکان کا ذکر کر بھی دیا ہو تو کم از کم ابتدا میں نماز کے حکم کے ساتھ ہی کوئی تفصیل نہیں بتائی کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے پس نماز کے متعلق کل کے کل احکام اور اس کے پڑھنے کا طریق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور یہی آپ کا سکھانا یعنی عمل سے بتانا کہ نماز یوں پڑھنی چاہیے۔ یا اپنے اقوال سے تشریح کرنا اور ذکر کا بتانا حدیث ہے۔ ایسا ہی دوسرے احکام قرآنی کے متعلق سمجھ لینا چاہیے۔ پس حدیث

کی ضرورت قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ آنحضرت صلعم صرف ایک اخلاقی واعظ نہ تھے۔ کہ کچھ مواعیظ آپ پر نازل ہوئے تو آپ نے لوگوں کو وہ سنا چھوڑے بلکہ آپ ابتدا سے ہی ایک شارع تھے اور اپنی قوم کو ایک خاص راہ پر چلانے اور ان کے تعلقات باللہ اور تعلقات انسانی میں ان کو تعلیم دینا یہ شروع سے ہی آپ کا کام تھا۔ آپ کا ہر ایک قول اور فعل صحابہ کے لئے ان کی زندگیوں کا سب سے قیمتی ذخیرہ تھا۔ خود قرآن کریم میں کس قدر زور سے اور بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور آپ کے ہر ایک حکم کو بجا لانے کی تاکید کی گئی ہے یہ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے اس لئے میں ان آیات کو دوہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ آیات بھی اس کے ساتھ ہی قابل غور ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ اور آپ کے پاک اخلاق کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر صحابہؓ آپ کے اقوال و افعال کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

حفاظت حدیث کیلئے آنحضرت صلعم کا خود تاکید کرنا

اب ہم حدیث پر غور کرتے ہیں کہ آیا حدیث میں اندرونی شہادت اس امر کی موجود ہے یا نہیں۔ کہ اس کی حفاظت کے سامان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے کوئی کئے یا نہیں سو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے احکام کے متعلق کیا تعلیم دی ہے کتاب العلم میں امام بخاریؒ نے یہ حدیث بیان کی ہے جو ابن عباسؓ کی روایت سے ہے کہ جب قوم عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار ہیں یعنی ہمارا راستہ ان کے درمیان میں سے ہے۔ پس ہم آپ کی خدمت میں سوائے حرمت والے مہینوں کے حاضر نہیں ہو سکتے تو آپ نے نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمانے کے بعد ان کو فرمایا احفظوہ واخبروہ من ورائکم یعنی خود ان باتوں کو خوب محفوظ رکھو۔ یعنی اچھی طرح سے یاد کر لو۔ اور جو لوگ تمہارے پیچھے رہ گئے ہیں ان کو یہ باتیں صحیح صحیح پہنچا دو۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حفاظت حدیث کا اور اس کو صحیح صحیح دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا واضح ثبوت ہو سکتا ہے؟ ایسا ہی مالک بن حویرث روایت کرتے ہیں قال لنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ حکم دیا کہ اپنے گھروں میں واپس چلے جاؤ۔ اور اپنے لوگوں کو یہ باتیں جو میں نے تمہیں سکھائی ہیں۔ سکھاؤ۔ یہ بھی پہلی حدیث کی موید ہے۔ یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا قبیلہ یا قوم ایمان لاتی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں سے

ایک شخص کو ان کی طرف بھیج دیا کرتے تھے تا وہ انہیں ان کے درمیان رہ کر احکام دین سکھائے۔ اور پوری طرح سے دین اسلام اور اس کی شریعت سے باخبر کرے۔ ایسے لوگ ان نومسلموں کو نہ صرف قرآن کریم سکھانے کیلئے بھیجے جاتے تھے بلکہ اس غرض سے کہ ان کو سکھائیں کہ کس طرح احکام دین کی پیروی کرنی چاہیئے۔ ایسے لوگ لازماً خود ایسے ہوتے تھے جو قرآن کریم کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے بھی اچھی طرح واقف ہوں تا ان لوگوں کو جن کی طرف وہ بھیجے جاتے تھے احکام دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل سکھا دیں۔ پس نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکیدی حکم تھا کہ آپ کے اقوال کو یاد رکھا جائے اور دوسروں کو صحیح صحیح پہنچایا جائے۔ بلکہ مختلف اقوام میں جو وقتاً فوقتاً اسلام میں داخل ہوتی تھیں۔ آپ کا واعظین کو بھیجنا تا کہ وہ انکو احکام دین سکھا دیں، اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں ہی اس پر عمل بھی کرا دیا۔ اور چونکہ واعظین جو ان نئی اسلام میں داخل ہوئی ہوئی قوموں کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ جو کچھ ان لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کے متعلق بتاتے تھے۔ ان کو خود بھی یہ موقعہ ملتا تھا کہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصدیق کرلیں۔ اس لئے ایسی احادیث ہر قسم کی غلطی اور آمیزش سے خالی تھیں۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب چھوٹے چھوٹے معاملات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں وہ لوگ عرض کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے ایک امام مقرر کیا۔ تو اس کے متعلق یہ شکایت آپ کے سامنے آئی کہ یہ قرأت لمبی پڑھتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ان احادیث میں جو اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی دوسروں تک پہنچنی شروع ہوگئی تھیں کسی قسم کا تصرف ہوا ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود واعظین کو مختلف اقوام کے اندر بھیجنا تا کہ وہ ان کو دین حق سے اور آپ کے حالات سے آگاہ کریں۔ یہ حدیث کی حفاظت کے سامانوں میں سے پہلا سامان تھا۔

اوپر میں یہ بھی دکھا چکا ہوں کہ جب ایک قوم آپ کے سامنے آتی تو آپ ان کو چند احکام دین سکھانے کے بعد یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کو یاد رکھو۔ اور اپنے لوگوں کو ان سے آگاہ کرو۔ اور کئی احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ حدیث کو صحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لئے ہمیشہ بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بیان کی ہے عن ابن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول نضر اللہ امرا سمع منا شیئا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی لہ من سامع یعنی ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا

فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سُنا بعینہٖ اسی طرح اس کو دوسروں کو پہنچایا۔ کیونکہ بعض وہ لوگ جن کو باتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ اصل سننے والوں سے اس بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی امام بخاریؒ بھی اس مضمون کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ عن عبدالرحمن بن ابی بکرۃ عن ابیہ ذکران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قعد علی بعیرہ وامسک انسان بخطامہ او بزمامہ قال ای یوم ھذا فسکتنا حتی ظننا انہ سیسمیہ سوی اسمہ قال الیس یوم النحر قلنا بلیٰ قال فای شھر ھذا فسکتنا حتی ظننا انہ سیسمیہ غیر اسمہ فقال الیس بذی الحجۃ قلنا بلیٰ قال فان دماءکم واموالکم واعراضکم بینکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسیٰ ان یبلغ من ھو اوعیٰ لہ منہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے۔ اور ایک آدمی نے مہار پکڑی ہوئی تھی۔ آپ نے سوال کیا یہ کونسا دن ہے ہم خاموش رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی جدید نام بتائیں گے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں یعنی ذوالحج کی دسویں تاریخ۔ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ نے سوال کیا کہ یہ کونسا مہینہ ہے ہم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپنے فرمایا کیا یہ ذوالحج کا مہینہ نہیں ہے ہم نے عرض کیا ہاں پھر آپنے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارا مال اور تمہاری عزت تمہارے درمیان ان سب کو وہی حرمت حاصل ہے جو تمہارے اس شہر میں اس مہینے کے اندر اس دن کو حاصل ہے۔ چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو میری بات پہنچا دے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو خبر پہنچا دے جو شاہد کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے۔ آخری حصہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکید پائی جاتی ہے کہ آپ کی باتیں دوسروں کو پہنچائی جائیں۔ اور اس بات کا ذکر کہ شاید وہ لوگ سننے والوں کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔ اس لئے کیا گیا ہے کہ ان غائبین کا جو صحابہؓ سے آنحضرت صلعم کی باتیں سنیں پھر یہ فرض ہے کہ وہ انکو یاد رکھکر دوسروں کو وہی باتیں پہنچا دیں۔ پس آنحضرت صلعم کے ان ارشادات کا ماحصل یہ ہے کہ آپ کی باتیں یعنی حدیث نبوی ضائع نہ ہو بلکہ ایک دوسرے کو مسلمان اسے پہنچاتے رہیں۔ یہ دوسری شہادت اس امر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے اور صحابہ کو بار بار آپنے یہ تاکید فرمائی کہ آپ کی حدیث بلا تغیر و تبدل دوسرے لوگوں تک پہنچائی جائے ؂

آنحضرت صلعم کے مسائل دین کو سمجھانے اور یاد کرانے کیلئے دہرانیکی عادت

بہت سی حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض ضروری باتوں کو تین تین دفعہ دوہرایا کرتے تھے تاکہ سننے والے اچھی طرح آپ کی بات کو سمجھ جائیں۔ عن انس عن

النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان اذا تکلم بکلمة اعادھا ثلثا حتی تفھم عنه واذا اتیٰ علیٰ قوم فسلم علیھم سلم علیھم ثلثا۔ یعنی تین دفعہ بیان کرنے سے غرض آپ کی یہ ہوتی تھی کہ سننے والا آپ کی بات کو سمجھ جائے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ کو جب ایک بات سمجھ میں نہ آئے تو خود دوبارہ سہ بارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے تھے۔ ابن ابی ملیکہ کی روایت بخاری میں ہے۔ ان عائشة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت لا تسمع شیئاً لا تعرفه الا راجعت فیه حتی تعرفه یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات بیان فرماتے اور وہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تو آپ بار بار پوچھتیں یہاں تک کہ اچھی طرح سے سمجھ لیتیں۔ اب ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ایک بات کو بار بار بیان کرنا تا کہ سننے والے اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور دوسری طرف خود صحابہ کا ایک بات کو آپ سے دریافت کرنا جب پہلی دفعہ بیان کرنے سے سمجھ میں نہ آئے۔ یہ دونوں امور اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ حدیث کی صحت اور سمجھانے میں اور صحابہؓ اس کے محفوظ رکھنے اور سمجھنے میں پوری کوشش کرتے تھے۔ یہ تیسرا سامان حفاظت حدیث کا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی پایا جاتا ہے۔

جھوٹی حدیث پر وعید

چوتھا سامان حفاظت حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ وعید تھے۔ جو آپ نے حدیث میں جھوٹ بولنے والے کے لئے بیان فرمائے عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار (رواہ الترمذی) ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ مجھ سے صرف وہی حدیث بیان کرو جس کو تم جانتے ہو کہ میری حدیث ہے۔ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بنائے گا وہ اپنی جگہ آگ میں سمجھے عن سمرة بن جندب والمغیرة بن شعبة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی یری انه کذب فھو احد الکاذبین۔ (رواہ مسلم) یعنی سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے وہ کاذب ہے۔ بخاری میں بھی اس مضمون کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تکذبوا علیّ فانه من کذب علیّ فلیلج النار۔ اور سلمہ کی روایت ہے۔ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علیّ مالم اقل فلیتبوأ مقعدہ من النار اسی مضمون کی روایتیں حضرت انسؓ ابوہریرہؓ اور زبیر سے مروی ہیں یہ حدیث قریباً بیس صحابہؓ سے صحیح احادیث میں مروی ہے۔ اسلئے حدیث متواتر کا مرتبہ رکھتی ہے۔

صحابہ کا بیان حدیث میں سخت احتیاط سے کام لینا

اگر اس قسم کی احادیث کے مضمون کو اور بھی غور کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر وقت اس بات سے ترساں رہتے تھے کہ کوئی غلط لفظ ان کے منہ سے نہ نکل جائے اور اس لئے جب تک کسی حدیث کے متعلق انہیں یقین کامل نہ ہوتا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ بخاری میں یہ حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے قال انس انه لیمنعنی ان احدثکم حدیثاً کثیراً ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من تعمد علی کذباً فلیتبوء مقعدہ من النار یعنی حضرت انسؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ بہت سی حدیثیں بیان کرنے سے مجھے یہ بات روکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں جائے گا۔ ایسا ہی عبداللہؓ ابن زبیر سے روایت ہے۔ قال قلت للزبیر انی لا اسمعك تحدث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما یحدث فلان وفلان قال اما انی لم افارقه ولکن سمعته یقول من کذب علی فلیتبوء مقعدہ من النار۔ یعنی عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد زبیر سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے۔ میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حدیثیں بیان کرتا ہؤا نہیں سنتا جس طرح فلاں اور فلاں آدمی بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کی یہ وجہ نہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا رہتا تھا۔ لیکن میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا۔ حضرت زبیر کا اس سے مطلب یہ نہیں تھا کہ دوسرے لوگ جو حدیثیں بیان کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں بلکہ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ جھوٹ کے متعلق سخت ممانعت اور وعید عذاب ہے۔ اس لئے میں زیادہ حدیثیں بیان نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے متعلق مجھے یقین کامل نہیں۔ کہ آنحضرت صلعم نے کیا فرمایا تھا۔ کذب کے معنوں میں صرف یہی داخل نہیں۔ کہ کوئی شخص ایک خبر یا واقعہ کو غلط جان کر بیان کرے بلکہ کذب بمعنی خطا بھی آتا ہے۔ اور محاورہ عرب میں کذب کا استعمال ان معنوں میں بہت ہے۔ احادیث میں بھی اسکا استعمال پایا جاتا ہے یعنی جہاں کسی شخص نے غلط واقعہ بیان کیا۔ حالانکہ وہ خود اسے غلط نہیں سمجھتا تھا تو اس کے متعلق لفظ کذب آیا ہے۔ جس کی تشریح بالاتفاق اخطاء سے کیگئی ہے۔ پس جن صحابہؓ کے متعلق یہ ذکر ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم ڈرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب نہ بولیں۔ اُن کا یہ منشا ہرگز نہ ہو سکتا تھا کہ ہم ڈرتے ہیں کہ جس کلام کو ہم نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا۔ اس کو عمداً آنحضرت صلعم کی طرف منسوب نہ کردیں۔ بلکہ ڈر اسی بات کا ہو سکتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کوئی غلط لفظ یا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو جائے

پس صحابہ رضؓ آنحضرتؐ کی حدیث کی روایت کرنے میں بڑے درجہ کے محتاط تھے۔ اور اس وعید کے سبب سے کہ جو کذب علی النبی کے متعلق وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے وہ ایسی حدیث کے بیان کرنے کی بھی جرأت نہ کرتے تھے جس کے متعلق انہیں یہ اندیشہ ہو کہ غلط بیانی ہو جائے گی۔ اس وعید میں اور صحابہ رضؓ کے اس کو روایات بیان کرتے وقت اس طرح مدنظر رکھنے میں ایک اور قطعی شہادت ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا پورا اہتمام اس بات کا کیا کہ آپ کی احادیث کے پہنچانے میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو اور صحابہ رضؓ نے آپ کی ان ہدایات پر پوری طرح عمل کر کے دکھایا

روایت حدیث میں سب صحابہ یکساں نہیں

مذکورہ بالا احادیث کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حدیث کے سننے اس کے سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے میں سب صحابہؓ یکساں نہ تھے بعض کو زیادہ وقت آنحضرتؐ کی صحبت میں رہنا میسر آتا تھا بعض کو بہت کم بعض فہم و فراست سے دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ رکھتے تھے۔ اور سب کی قوت حافظہ بھی برابر نہ تھی۔ اسی فرق کی وجہ سے روایت حدیث میں بعض کا مرتبہ بعض سے زیادہ ہے۔ مثلاً بہت سے صحابی ایسے تھے کہ اپنے کام بھی کرتے تھے۔ اور فرصت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ بعض نے باریاں مقرر کی ہوئی تھیں جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک انصاری کے ساتھ جو آپ کا ہمسایہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کے لئے باری مقرر کی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس دن کی خبریں اور وحی حضرت عمر رضؓ کو پہنچاتے۔ اور دوسرے دن حضرت عمر ایسا کرتے۔ پھر بعض صحابہ رضؓ ان سے بھی بڑھ کر مشتاق اس بات کے تھے کہ سارا وقت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے رہیں۔ انہی میں ابوہریرہ بھی تھے۔ جن کی حدیثیں دوسرے صحابیوں سے بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ابوہریرہ کا اشتیاق حفاظت حدیث کا اس قدر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے خوب آگاہ تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب ابوہریرہ رضؓ نے آنحضرت صلعم سے یہ سوال کیا۔ یا رسول اللہ من اسعد الناس بشفاعتک یوم القیامۃ تو آپ نے قبل اس کا جواب دینے کے فرمایا۔ لقد ظننت یا اباھریرۃ ان لا یسالنی عن ھذا الحدیث احد اول منک لما رأیت من حرصک علی الحدیث یعنی آپ نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ میں اس وجہ سے کہ تمہارا اشتیاق حدیث کے لئے خوب جانتا ہوں۔ اس بات کو جانتا تھا کہ تم ہی پہلے مجھ سے یہ سوال پوچھو گے (صحیح بخاری کتاب العلم) ایسا ہی صحیح بخاری میں دوسری جگہ یہ روایت حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔

ابوہریرہ کا اشتیاق حفظ حدیث

قال ان الناس يقولون اكثر ابو هريرة ولولا ايتان فی كتاب الله ما حدثت حديثا ثم يتلو ان الذين يكتمون ما انزلنا من البينات الی قوله الرحيم۔ ان اخواننا من المهاجرين كان يشغلهم الصفق بالاسواق وان اخواننا من الانصار كان يشغلهم العمل فی اموالهم وان ابا هريرة كان يلزم رسول الله صلی الله عليه وسلم الشبع بطنه ويحضر ما لا يحضرون ويحفظ ما لا يحفظون یعنی ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ اور اگر قرآن کریم میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر آپ یہ آیتیں پڑھتے ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ جن میں ہدایت اور بینات کے چھپانے پر سخت وعید آیا ہے۔ پھر فرمایا کہ بات یہ ہے کہ ہمارے بھائی جو مہاجرین تھے انکو تو بازار میں خرید فروخت روکے رکھتی تھی اور ہمارے بھائی جو انصار میں سے تھے انکو اپنے کاروبار روکے رکھتے تھے۔ اور ابوہریرہؓ کا یہ حال تھا کہ دین سیکھنے کیلئے رسول اللہ صلعم کے ساتھ لگا رہتا۔ اسلئے وہ ایسے ایسے واقعات کو مشاہدہ کرتا تھا جنکو دوسرے صحابی نہیں کرتے تھے۔ اور ایسی ایسی باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد رکھتا تھا۔ جن کو دوسرے یاد نہیں رکھتے تھے۔ پس بڑی بھاری وجہ کہ بعض صحابہ کی احادیث کم پائی جاتی ہیں۔ اور بعض کی زیادہ یہی ہے کہ بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کا زیادہ اتفاق ہوتا تھا اور بعض کو کم۔ اس کی تائید میں امام بخاری نے تاریخ میں اور حاکم نے مستدرک میں یہ روایت طلحہ بن عبید اللہ سے بیان کی ہے لا اشك انه سمع من رسول الله صلی الله عليه وسلم ما لا نسمع وذلك انه كان مسكينا لا شئ له ضيفا لرسول الله صلی الله عليه وسلم۔ ایسا ہی ابن عمر کا یہ قول احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے جو ابوہریرہ کے متعلق ہے كنت الزمنا لرسول الله صلی الله عليه وسلم واعرفنا بحديثه۔ اور بخاری نے تاریخ میں اور بیہقی نے یہ روایت محمد بن عمارہ بن حزم سے کی ہے۔ انه قعد فی مجلس فيه مشيخة من الصحابة بضعة عشر رجلا فجعل ابو هريرة يحدثهم عن رسول الله فلا يعرفه بعضهم فيراجعون فيه حتی يعرفوه ثم يحدثهم بالحديث كذلك حتی فعل مرارا فعرفت يومئذ ان ابا هريرة احفظ الناس۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی لوگ کہا کرتے تھے کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ابوہریرہؓ نے ایک ایسا کہنے والے سے پوچھا کہ کل عشا کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کون کون سی سورتیں پڑھی تھیں وہ نہ بتا سکا۔ اور پھر انہوں نے اس کو بتا دیا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ کو ابتدا سے ہی یہ شوق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معمولی سے معمولی باتوں کو توجہ سے دیکھتے اور یاد

رکھتے تھے۔ ان تمام واقعات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے علم کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اور آپ کے سامنے ہی حدیثیں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔ اور آپ نے سب وعید ان لوگوں کے لئے بیان فرمائے تھے جو آپ کی حدیث میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کریں۔ انہی تمام احتیاطوں کی وجہ سے صحابہ حدیث کے بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کے محتاط تھے۔ اور اس ڈر سے کہ شاید کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ بغیر یقین کامل کے کسی حدیث کو بیان نہ کرتے تھے۔ جو لوگ صحیح احادیث بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کے محتاط تھے ان کی نسبت یہ وہم کرنا کہ انہوں نے وضعی حدیثیں بنا بنا کر پھیلائیں۔ پرلے درجہ کی حماقت ہے۔

پہلی صدی کے آخر عمر بن عبدالعزیز کے احکام حفاظت حدیث کیلئے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ پر افترا کا الزام ایک شرمناک افترا ہے۔ اور اس کی کوئی شہادت اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک صحابہ رضی اللہ عنہم زندہ رہے اس وقت تک کوئی وضعی حدیث اسلام میں نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ احادیث کا وضع ہونا صحابہؓ بلکہ تابعین کے زمانہ کے بھی بعد شروع ہوا۔ اور علماء محققین نے اس خطرہ کو محسوس کر کے جلدی اس کا تدارک شروع کر دیا۔ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک کوئی اس قسم کی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وضع احادیث اس وقت شروع ہو چکا تھا۔ بلکہ اس امر کی تاریخی شہادتیں ملتی ہیں۔ کہ اس وقت تک اسلامی دنیا میں وضعی احادیث کا نام ونشان نہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے متعلق جو پہلی صدی ہجری کے آخر میں خلیفہ ہوئے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے کتب عمر بن عبدالعزیز الی ابی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبه فانی خفت دروس العلم وذهاب العلماء ولا تقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلك حتی یكون سرا (یعنی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو لکھا۔ (ابوبکر بن حزم آپ کے ماتحت حاکم مدینہ تھے اور خود تابعی تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے اسے نگاہ رکھو اور اسے لکھ لو۔ میں ڈرتا ہوں کہ علم (یعنی علم حدیث) گم نہ ہو جائے۔ اور علماء سب اٹھ نہ جائیں۔ اور سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے اور کچھ قبول نہ کرو اور چاہیئے کہ علم کو پھیلایا جائے۔ اور علمی مجالس ہوا کریں۔ تاکہ جو لوگ (حدیث سے) ناواقف ہیں۔ ان کو تعلیم دی جائے۔ کیونکہ علم نابود نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مخفی نہ ہو جائے۔ ابونعیم نے اپنی تاریخ اصبہان میں لکھا ہے کہ یہ حکم صرف حاکم مدینہ کے نام ہی نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ تمام صوبوں کے حاکموں کے نام یہی حکم خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے بھیجا تھا

خواہ یہ حکم ایک حاکم کے نام بھیجا گیا ہو یا سب کے۔ میں جو استدلال اس سے کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت تک جب خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے یہ حکم لکھا۔ جو تاریخی طور پر ثابت ہے مسلمانوں کے درمیان وضعی احادیث پیدا نہ ہوئی تھیں۔ اور یہ بات اس حکم کے الفاظ پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ امیر المومنین نے جس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ علماء مرتے جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ علم حدیث گم ہو جائے۔ اس لئے تم تمام حدیثوں کو جو تمہیں ملیں لکھ لو۔ اور وضعی حدیث کا نام تک بھی نہیں لیا۔ اگر وضعی احادیث اس وقت پیدا ہو گئی تھیں۔ تو بڑا خطرہ یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ علماء مر جائیں گے تو علم حدیث گم ہو جائے گا بلکہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وضعی احادیث بکثرت مروج ہو گئی ہیں۔ اور صحیح احادیث کو ان سے الگ کرنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ علمی تذکرے بڑھائے جائیں۔ اور علمی مجالس منعقد کی جائیں۔ تا ناواقف لوگ بھی احادیث سے واقف ہو جائیں۔ اور یہ جو کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوائے اور کچھ قبول نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ اور مثلاً کسی صحابی کا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے غلط نہ کر دیا جائے۔ بہر حال وضعی احادیث کا اس تحریر میں ذکر تک بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ان کی کثرت یا ان کے مروج ہونے کا ذکر ہو۔

صحابہ کا حدیث کی صحت معلوم کرنے کیلئے لمبے سفر کرنا

بہت سے اور واقعات تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کسی حدیث کے قبول کرنے یا اس کو آگے بیان کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ بلکہ ایک ایک حدیث کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کی خاطر سینکڑوں میلوں کے سفر اختیار کرتے اور ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ جابرؓ بن عبد اللہؓ کا تذکرہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ کہ ایک حدیث کی خاطر انہوں نے مدینہ سے شام کا سفر کیا۔ دیکھو باب الخروج فی طلب العلم جہاں لکھا ہے۔ رحل جابر بن عبد اللہ مسیرۃ شہر الی عبد اللہ بن انیس فی حدیث واحد یعنی جابر بن عبد اللہ نے ایک مہینہ کا سفر عبد اللہ بن انیس کی طرف صرف ایک حدیث کی خاطر کیا۔ جس کا تذکرہ جابرؓ کے اپنے الفاظ میں یوں موجود ہے۔ بلغنی عن رجل حدیث سمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاشتریت بعیراً ثم شددت رحلی فسرت الیہ شہراً حتی قدمت الشام فی ذا عبد اللہ بن انیس فقلت للبواب قل لہ جابر علی الباب فقال ابن عبد اللہ قلت نعم فخرج فاعتنقنی فقلت حدیث بلغنی عنک انک سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخشیت ان اموت قبل ان اسمعہ۔ ایسا ہی ابو ایوب انصاری کے متعلق یہ روایت ہے کہ انہوں نے عقبہ بن عامر کی طرف ایک حدیث سننے کے لئے لمبا سفر کیا۔ ایسا ہی ایک اور صحابی کا ذکر ہے کہ اس نے فضالہ بن عبید کو ملنے

کے لئے مصر کا سفر کیا۔ کیونکہ وہ ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کرتے تھے۔ یہ تھا صحابہؓ کا جوش اور عشق آنحضرتؐ کی حدیث کی تلاش میں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے جو کچھ سفر کی صعوبتیں تھیں وہ ان کی نظر میں ایک حدیث کے سننے کے بالمقابل ہیچ تھیں۔ یہی حال تابعین کا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ابوالعالیہ کی روایت سے قطیب نے بیان کیا ہے کہ کنا نسمع عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا نرضی حتی خرجنا الیہم فسمعنا منہم یعنی ہم آنحضرت صلعم کے صحابیوں کی روایت سے ایک حدیث کو سنتے تھے مگر ہم صبر نہ کرتے تھے جب تک سفر کر کے خود ان صحابیوں کے منہ سے اس حدیث کو نہ سُن لیں۔ اس قسم کے کئی واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سب کا بیان کرنا موجب طوالت ہوگا۔

آنحضرت صلعم کے سامنے بعض احادیث کا تحریر میں آجانا

احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ابتدا میں تحریر میں نہیں لائی گئیں بلکہ زبانی سلسلہ روایت سے ہی محدثین تک پہنچی ہیں۔ میور کہتا ہے کہ یہ کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ عرب اپنے حافظہ پر ایسا ہی بھروسہ کر سکتے تھے۔ جیسا تحریر پر۔ اور پھر لکھتا ہے کہ نہ صرف حافظہ پورے طور پر حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ بلکہ زبانی روایت کے سلسلہ میں غلطیوں اور مبالغہ کی آمیزش بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اب اول تو یہ کہنا کسی صورت میں صحیح نہیں۔ کہ پہلی صدی کے اخیر تک حدیث کا کوئی حصہ بھی لکھا نہیں گیا۔ ایسی روایات بکثرت موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی بعض لوگ حدیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمرو حدیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی حدیث کا موجود ہونا ثابت ہے۔ فتح مکہ والے سال میں خزاعہ نے بنی لیث کا ایک آدمی بطور کسی گذشتہ خون کے قصاص کے مار ڈالا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ پڑھا۔ اور جب آپ تمام کر چکے تو اہل یمن سے ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے یہ خطبہ لکھوا دیجئے۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے لکھ دیا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب آنحضرت صلعم نے خطبہ پڑھا تو لوگوں نے اسے اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ورنہ بعد میں لکھا کیونکر جاتا۔ یہ تمام روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ اور ان سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی بعض صحابہؓ حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے۔ اور ایسا ہی یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ لکھنے کا رواج آپ کے بعد اور بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ یہ بات میور کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے کیونکہ ایک موقعہ پر وہ لکھتا ہے کہ اگر ان باتوں کو جو پیش کی جاتی ہیں تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان سے

اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ کہ بعض صحابہؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تحریری یادداشتیں تھیں۔ مگر وہ لکھتا ہے کہ جو کتب احادیث اس وقت موجود تھیں ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی احادیث کسی محدث نے تحریری یادداشت سے لی تھیں۔ اور کونسی صرف زبانی روایت کے سلسلے سے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی طریق درست ہے۔ کیونکہ اگر کسی حدیث کے متعلق سلسلہ روایت کو چھوڑ کر صرف اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا۔ کہ یہ حدیث کسی پرانی یادداشت سے لی گئی ہے۔ تو اول تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا۔ کیونکہ سلسلہ رواۃ کے معلوم ہونے پر تو حدیث پر جرح بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف ایک پرانی یادداشت کا حوالہ دینے سے آیندہ نسلوں کو یہ کیونکر معلوم ہو سکتا کہ وہ یادداشت کیسی تھی یا کس شخص کی لکھی ہوئی تھی۔ پس ایسی حدیثیں بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتیں۔ اور یہ بات صاف ہے کہ ایسی یادداشتوں کا اول تو محفوظ رکھنا آسان امر نہ تھا۔ اور پھر بڑی مشکل یہ پڑتی کہ یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ فلاں یادداشت واقعی فلاں صحابی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ یا بعد میں کسی نے جعل بنا لیا ہے۔ کیونکہ زبانی سلسلہ میں تو ہر ایک راوی کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ اور ایک ایک تنقید کے نیچے آ سکتا ہے۔ مگر تحریری یادداشتوں میں ایک ایسے زمانہ میں جب چھاپہ خانہ کا رواج نہیں تھا۔ اور اس لئے عام طور پر کوئی تحریر مشتہر نہ ہو سکتی تھی کہ سب لوگ یقین کریں کہ فلاں بات کے لکھنے والا واقعی فلاں شخص ہے۔ ایسے زمانہ اور ان حالات میں اگر تحریری یادداشتوں سے حدیثیں جمع کی جاتیں تو وہ ایسی مشتبہ ہو جاتیں کہ بالکل قابل اعتبار نہ رہتیں۔ علاوہ ازیں محدثین خود کب اس بات پر مطمئن ہو سکتے تھے کہ ایک یادداشت ان کے ہاتھ لگ گئی ہے کیونکہ اس میں وہ خود اپنی تنقید سے کام نہ لے سکتے تھے بلکہ لازماً سلسلہ رواۃ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جبتک راویوں کے ذریعہ سے کوئی حدیث کسی صحابی تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک وہ قطعاً اس کے متعلق مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ تحریری یادداشتیں اصل میں ابتدا میں بھی حافظہ کو تازہ کرنے کے لئے تھیں۔ اور محدثین نے بھی ان سے یہی کام لیا یعنی ان کو بطور تائیدی شہادت قبول کیا۔ اسی لئے ان کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی؛

عام طور پر حدیث کے نہ لکھا جانیکا جواب

مگر معترض کہتا ہے کہ اگر تحریری یادداشتیں رکھی بھی گئیں تو صرف چند حدیثوں کی رکھی گئیں۔ اور عام طور پر حدیث لکھنے کا رواج ابتدائی زمانہ میں نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی احادیث کے لکھنے سے روکا۔ اور آپ کا اس ممانعت سے یہی مطلب تھا کہ عام طور پر حدیث کو نہ لکھا جائے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ قرآن جیسے جیسے نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا۔ اور اس کا لکھنا

ضروری تھا۔ اس لئے اس اندیشہ سے کہ مبادا احدیث کے عام طور پر لکھا جانے سے قرآن کریم اور حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں۔ آپ نے حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی۔ اور جہاں ایسا اندیشہ نہیں تھا وہاں لکھنے کی اجازت بھی دی۔ کیونکہ آپ کی اجازت سے حدیثوں کا لکھا جانا بھی ثابت ہے۔ عام طور پر حدیث کے لکھا جانے میں ایک اور خطرہ بھی تھا وہ یہ کہ اگر حدیث کے لکھنے کا رواج ہو جاتا تو حدیث کو زبانی یاد رکھنے کی ضرورت بالکل مفقود ہو جاتی۔ اور اس طرح پر زبانی روایت کا سلسلہ قطعاً موقوف ہو کر صرف یادداشتوں پر حدیث کی بنا رہ جاتی جس میں جعل کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کے لکھنے میں یہ دقت کیوں پیش نہ آئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث کا مقابلہ اس پہلو پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کی ہر ایک آیت سینکڑوں آدمی اس کے نازل ہوتے ہی حفظ کر لیتے تھے۔ اور اس کا تحریر میں لانا حفاظت کے لئے ایک زائد سامان تھا علاوہ ازیں قرآن شریف عام طور پر نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اور اس کی کوئی آیت چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ اس کے لئے ابتدا سے ہی یہ سامان تھا کہ الگ الگ سورتیں تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کے نازل ہوتے ہی فرما دیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں مقام پر رکھی جائے۔ لیکن حدیث کو یہ باتیں حاصل نہ تھیں کہ بعض احادیث اس میں شک نہیں ایسی تھیں کہ تمام مسلمانوں کے لئے ان کا جاننا ضروری تھا۔ مثلاً احکام نماز، زکوٰۃ وغیرہ۔ مگر بہت سی حدیثیں ایسی تھیں کہ وہ کل صحابہؓ کے علم میں نہ آ سکتی تھیں۔ ایک شخص ایک وقت آیا اور اس نے کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی۔ وہ بات اپنے وقت پر ہو گئی۔ اور کسی صحابی نے جو اس وقت موجود تھا اس کو یاد رکھ لیا۔ مگر قرآن کریم کی آیات کی طرح احادیث کا عام طور پر اعلان نہ ہوتا تھا۔ یعنی آیت جب نازل ہوتی تو اس کو لکھ بھی لیا جاتا۔ اور عام طور پر اس کا اعلان بھی ہو جاتا۔ حافظ لوگ اس کو مطابق ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جگہ پر رکھ کر یاد بھی کر لیتے۔ اور عام طور پر مسلمانوں میں اس کا چرچا ہو جاتا۔ خالی لکھنا کافی نہ تھا۔ اور نہ ہی خالی لکھ لینا حدیث کے لئے کافی ہوتا۔ بلکہ مشکلات اور بھی بڑھ جاتیں۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے جمع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حافظ پر اعتبار نہ تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب جمع کیلئے اولاً ابو بکرؓ کو تحریک کی۔ تو وجہ یہ بیان کی کہ بہت سے حافظان قرآن یمامہ کی لڑائی میں شہید ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لکھے ہوئے اجزا کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ تا ایسا نہ ہو کہ تمام حافظوں کی موت سے قرآن کریم کا کوئی حصہ مشتبہ ہو جائے جس سے صاف معلوم ہوتا

ہے کہ حافظہ پر اعتبار تو تھا۔ مگر ڈر یہ تھا کہ جن لوگوں نے کل قرآن کریم کو حفظ کیا ہوا ہے۔ وہ جنگوں میں شہید ہو کر سب کے سب دنیا سے اُٹھ نہ جائیں۔ غرض کہ قرآن کریم کی حفاظت کے لئے علاوہ تحریر کے اور بہت سے سامان موجود تھے۔ جو حدیث کو میسر نہ آسکتے تھے۔ اس لئے اس کی حفاظت کا طریق صرف حافظہ کو ہی قرار دیا گیا جب تک کہ وہ وقت نہ آگیا کہ حدیث کا علم کافی طور پر پھیل کر اس قابل ہو گیا کہ اسے کتابوں میں جمع کر دیا جائے۔ اس قدر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث کی ایسی حفاظت نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ جیسی قرآن کریم کی ہوئی۔ مگر تاہم تاریخی شہادت حدیث کی حفاظت کی بھی کافی موجود ہے۔

عربوں کا حافظہ پر بھروسہ

کہا جاتا ہے کہ حافظہ پر اس قدر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس قدر تحریر پر۔ یہ قول اس زمانہ کے لئے تو بے شک درست ہے۔ لیکن ابتدائی زمانہ میں بالخصوص عرب کے حافظہ نے جو حیرت انگیز کارروائیاں دکھائی ہیں وہ آج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ اگر عرب میں حافظہ ایسا ہی ناقابل اعتبار ہوتا جیسا کہ میور کہتا ہے۔ تو آج نہ عرب کی جاہلیت اور ابتدائی اسلامی زمانہ کے اشعار ہی ہم تک پہنچتے اور نہ ہی لغت اور نحو کے علوم کی ان باریک باتوں تک ہم پہنچ سکتے جن سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ عربی اشعار بعینہٖ اسی طرح کے سلسلہ رواۃ سے ہم تک پہنچے ہیں جس طرح احادیث۔ اور اصل بات یہ ہے کہ یہی ایک طریق اس زمانہ میں کسی علم کی حفاظت کا تھا۔ اشعار کے راوی نہ صرف کثرت سے شعر ہی زبانی سلسلہ روایت سے بیان کر سکتے تھے بلکہ وہ شاعروں کے نام اور ان کے حالات سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اور ان کے شعروں میں جو حوالے ہوتے تھے ان سے بھی خوب آگاہ تھے۔ شعروں کے مشہور راویوں میں سے ایک اصمعی ہیں جنہوں نے اپنے متعلق لکھا ہے۔ کہ قبل بلوغت کو پہنچنے کے میں نے بارہ ہزار شعر حفظ کر لئے تھے۔ (عقد الفرید) کیا ان لوگوں کے لئے جن میں ایسے حافظہ والے لوگ موجود تھے۔ چند ہزار حدیث کا یاد رکھ لینا کوئی مشکل امر تھا؟ ابو ضمضم کے متعلق اصمعی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر چند نوجوان بعد عشا کے اس کے پاس پہنچے اور بیان کیا کہ ہم تم سے کچھ باتیں سننا چاہتے ہیں اس نے ان کو ایک سو شاعروں کے شعر سنائے۔ جن سب کا نام عمر تھا۔ شعبی کہتا ہے کہ میں نے شعر سے کمتر روایت کسی علم میں نہیں کی۔ اور شعر میں میری روایت اس قدر ہے کہ اگر میں چاہوں تو برابر ایک مہینہ تک شعر پڑھتا چلا جاؤں اور کوئی شعر دوبارہ نہ آئے گا۔ پس اگر اس قدر اشعار جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ محض زبانی سلسلہ رواۃ سے اسلام سے بھی پہلے زمانہ

سے ہم تک پہنچ گئے تو میں نہیں سمجھتا کہ حدیث کے اس سلسلہ سے پہنچنے میں مخالفین کو کون سی دقتیں نظر آتی ہیں ؛

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ شعر کا سلسلہ روایت یوں ہی کوئی لغو کام تھا۔ بلکہ لغت اور نحو کی بنا انہی اشعار پر ہے جو زبانی روایتوں سے پہنچے ہیں۔ ہر زمانہ میں جب کبھی کسی لفظ کے معنوں میں یا کسی نحو کے قاعدہ میں تنازعہ پیدا ہوا ہے تو شعر کی سند سے اس کا آخری فیصلہ ہوتا رہا ہے۔ اور کسی نے آج تک یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ شعر تو زبانی روایت سے مدت تک چلا آیا تھا۔ اور بہت دیر بعد تحریر میں آیا۔ اس کا اعتبار کچھ نہیں۔ پس تعجب ہے کہ جس صورت میں نازک ترین مسائل لغت یا نحو صرف زبانی یادداشتوں کی بنا پر حل کئے جا سکتے ہیں۔ تو حدیث کے لئے اتنا شور کیوں مچایا جاتا ہے کہ زبانی روایتوں کے ہونے کی وجہ سے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہؓ میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جن کو پرانے شعر یاد تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کو بھی کئی ہزار شعر جاہلیت کے یاد تھے تو کیا کئی سو حدیث وہ یاد نہ رکھ سکتی تھیں۔ ابن عباس کے متعلق یہ واقعہ دیوان عمر ابن ابی ربیعہ کے شرح میں لکھا ہے کہ جب عمر چند شعر بنا کر ان کے پاس مشورہ کے لئے لایا کہ آیا یہ شائع کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ تو آپ نے صرف ایک ہی دفعہ اس سے سن کر دوبارہ سب کے سب خود سنا دیئے یہ قریباً ستر شعر تھے۔ اس پر بعض حاضرین نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ شعر آپ کو پہلے معلوم تھے تو آپ نے ان کے تعجب پر تعجب کر کے جواب دیا او یسمع احد شیئاً ولا یحفظہ یعنی کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات کو سنے اور پھر اسے یاد نہ رکھے۔ کیا ایسے انسان کیلئے اڑھائی سو حدیث کا یاد رکھنا کوئی مشکل امر تھا؟

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ احادیث کا زبانی یاد رکھنا کوئی ایسا کام نہ تھا جس کے وہ لوگ عادی نہ ہوں۔ بلکہ ان کے لئے یہ ایک معمولی سی بات تھی اس لئے تحریری یادداشتیں اگر موجود بھی تھیں تو محدثین نے معتبر روایت کو ہی مانا ہے۔ اور تحریر کی تائید بھی جب تک روایت سے نہ ہو یا کم از کم تحریر کے متعلق روایت نہ ہو اسے کوئی وقعت نہیں دی۔ امام بخاری کو چھ لاکھ حدیث یاد تھی اور انہوں نے ایک کو بھی لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ کئی لوگ اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کا آپ کے حافظہ سے مقابلہ کر کے اپنی تحریری یادداشتوں کو درست کیا کرتے تھے ؛

ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جھوٹ کی ملاوٹ صحابہؓ کے وقت تک یعنی پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ہرگز نہیں ہوئی بلکہ جب صحابہؓ کل اس

دنیا سے گذر گئے۔ اور اکثر تابعین بھی انتقال کر چکے۔ تو اس وقت جھوٹی حدیثوں کا بننا شروع ہوا مگر اس خطرہ کو فی الفور علماء نے محسوس کر کے جمع حدیث کا کام شروع کر دیا۔

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا شوق

پس یہ ظاہر ہے کہ جمع حدیث کا کام ایک حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی صحابہ اس وقت اس کام میں نہایت سرگرمی سے مصروف تھے کہ آپ کی احادیث کو یاد کریں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا کام اور بھی زیادہ شوق اور دلچسپی سے کیا جانے لگا۔ جیسا کہ میں نے مثالیں بیان کر کے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک ایک حدیث کی خاطر بعض صحابہؓ نے بڑی بڑی مشقتیں اٹھا کر لمبے لمبے سفر کئے۔ اور شام اور مصر تک پہنچے۔ اصل میں یہ سب کوششیں حدیث کے جمع کرنے کے لیے ہی تھیں۔ یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ بعض صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری یادداشتیں حدیثوں کی لکھ لیا کرتے تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد احادیث کا تحریر میں لانا اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام لکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ انسؓ کی حدیث سے پایا جاتا ہے کہ آپ انہی احکام کی نقل کر کے عاملوں کو بھیجا کرتے تھے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جمع حدیث کا کام ایک سو سال کے بعد شروع ہوا۔ تو اس وقت نہ تو ہمارا یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا اور نہ ہی یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے محدثین موجود نہ تھے جو حدیثوں کو جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کرتے اور نہ ہی یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کو لکھا جانا ثابت نہیں بلکہ اس وقت جمع حدیث سے ہمارا منشا تدوین حدیث ہوتا ہے یعنی احادیث کا کتابوں میں ابواب کی تقسیم اور ترتیب کے ساتھ لکھا جانا سو انہی آخری معنوں میں جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے آخر پر یا اسکے بعد شروع ہوا۔ اور اس کی تکمیل حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمۃ نے کی۔ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو عمداً یا غلطی سے گڑبڑ کر دینے سے حدیث کی صداقت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوئے ہیں کیونکہ ایک طرف تو کہہ دیا جاتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور پھر مراد اس سے یہ لی جاتی ہے کہ گویا اس سے پہلے حدیث کو نہ لوگ اکٹھا کیا کرتے تھے نہ اس کی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ ہی اس کی حفاظت کا کوئی سامان تھا پس سب سے اول یہ ضروری ہے کہ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور ان کو الگ الگ رکھا جائے۔ اور اس بات کو دل میں بٹھا لیا جائے کہ امام مالک کی مؤطا اور امام بخاری کی صحیح سے پہلے بھی حدیث کو جمع کیا جاتا تھا، اور اسکی حفاظت کے سامان موجود تھے اور اس کے ساتھ درس تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

جمع حدیث کے پانچ مرحلے پہلا مرحلہ خود زمانہ نبوی ہے

غور سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پانچ مرحلوں میں سے ہو کر گذرا ہے سب سے اول مرحلہ اس کا زمانہ نبوی ہے۔ اس بات کو میں ثابت کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت سے صحابی خاص توجہ اور شوق سے آپ کے اقوال کو جمع کرتے اور آپ کے ہر ایک فعل کو نظر غور سے دیکھ کر یاد رکھتے تھے۔ یہی سب سے پہلے محدثین تھے۔ ان میں سب سے بڑھ کر شوق رکھنے والے حضرت ابوہریرہ رضؓ تھے۔ جن کا شوق جمع حدیث کا اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ حتی الوسع ہر وقت آنحضرت صلعم کے ساتھ لگے رہتے۔ اور جمع حدیث کے سوائے آپ کا کوئی شغل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے دعا بھی کی تھی جس کے بعد حدیث کو یاد رکھنے میں خدا تعالیٰ نے آپ کو خاص قوت بخشی تھی۔ آپ کے علاوہ بعض اور صحابی ایسے تھے جن کو آپ کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے جمع حدیث کا خاص موقعہ حاصل تھا۔ جیسے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت انس رضؓ بن مالک جو کئی سال تک آپ کے خادم رہے۔ اگرچہ صدیقہ کے سوا اور بھی ازواج مطہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں۔ مگر جو قابلیت اللہ تعالیٰ نے صدیقہ کو جمع اور حفاظت حدیث کے لئے دی تھی وہ اوروں میں نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ کو ہزارہا شعر ایام جاہلیت کے شعرا کے یاد تھے اور آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ اور علم سے خاص دلچسپی اور محبت تھی۔ ایسا ہی بعض اور صحابی تھے جن کو خداداد قابلیت کے علاوہ موقع بھی ایسا مل گیا تھا کہ وہ جمع اور حفاظت حدیث کا کام کرتے تھے۔ جیسے عبداللہ رضؓ بن عمرؓ اور عبداللہ رضؓ بن عباس یہ دونوں نوجوان علم دین میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اور بہت سی احادیث انہوں نے جمع کیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ عبداللہ رضؓ بن عمروؓ بھی جمع حدیث کا کام کیا کرتے تھے۔ اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ حدیثوں کو لکھ بھی لیا کرتے تھے ایسا ہی کئی اور صحابی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حدیثوں کے یاد رکھنے میں بہت شوق ظاہر کرتے تھے۔ اور یہ کام جو وہ کر رہے تھے دراصل جمع حدیث کا بنیادی پتھر تھا۔

جمع حدیث کا دوسرا مرحلہ زمانہ صحابہ ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث نبوی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے علاوہ ان چند صحابیوں کے جو آپ کی زندگی میں ہی جمع حدیث کا کام کرتے تھے ہزارہا اور صحابہ رضؓ تھے۔ اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو کوئی نہ کوئی ایسی حدیث یاد رکھتے تھے جو عام طور پر شہرت یافتہ نہیں تھی۔ پس اس مرحلہ پر جمع حدیث کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان تمام سرچشموں سے حدیث کو اکٹھا کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ مگر ضروریات زمانہ نے اس کو کئی طرح سے آسان کر دیا تھا۔ سب سے اول جیسا کہ ہم پہلے بھی دکھا چکے ہیں۔ ہر ایک صحابی جو کسی حدیث

کو یاد رکھتا تھا وہ اسے اپنا مقدس فرض سمجھتا تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچا دے کیونکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا لیبلغ الشاھد الغائب۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے تھوڑے دن بعد مخبر صادق کی پیشگوئی کے مطابق صحابہؓ دور دراز ملکوں میں پھیل گئے تھے۔ اور ہر جگہ انہوں نے حدیث کا چرچا پھیلا دیا تھا۔ اور جو جو احادیث ان کو معلوم تھیں وہ دوسروں تک پہنچا دی تھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں احادیث کی تدریس کا سلسلہ شام مصر وغیرہ ممالک میں پھیل گیا تھا۔ یہاں یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل اس وقت تک جاری رہا۔ جب تدوین حدیث کا وہ زمانہ پہنچا۔ کہ محدثین نے جابجا پھر کر کل احادیث کو کتابوں میں اکٹھا کر دیا۔

دوئم آنحضرت صلعم کے بعد خلفاء کے زمانے میں کئی صحابی ایسے تھے جنہوں نے آنحضرت کے کسی قول کی بنا پر بعض حقوق طلب کئے۔ اور ان حقوق کے دیا جانے یا ان کے انکار کے وقت آپ کی بہت سی احادیث کی تصریح ہو گئی۔ اور وہ عام طور پر شہرت پا گئیں۔ مثلاً مغیرہؓ نے ایک حدیث کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ سے بعض حقوق طلب کئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیا اور جب آپ کا اطمینان ہو گیا کہ واقعی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے تو آپ نے وہ حقوق اسے عطا فرما دیئے۔ پس اس طرح پر یہ حدیث عام شہرت پا گئی۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں جن کا علم پہلے چند اشخاص تک محدود تھا۔ عام طور پر شائع ہوتی اور پھیلتی رہیں۔ اور علم حدیث کے مجموعہ میں شامل ہوتی گئیں۔ سوئم نئی نئی ضرورتیں جو مسلمانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آتی تھیں بہت سی حدیثوں کی اشاعت کا موجب ہو گئیں۔ کیونکہ جب کبھی کوئی مقدمہ یا تنازعہ یا کوئی امر فیصلہ طلب پیش ہوتا تو قرآن کریم کے بعد سب سے پہلے حدیث کی طرف ہی صحابہؓ رجوع کرتے تھے۔ اور جہاں امر پیش آمدہ پر کوئی حدیث پوری پوری منطبق نہ ہوتی تو اس کے قریب قریب کوئی حدیث تلاش کی جاتی اور اس پر قیاس کر کے امر پیش آمدہ کا فیصلہ کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس صورت میں احادیث کی اچھی طرح پڑتال کی جاتی ہو گی تا کہ عین مطابق واقعہ کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مل جائے اور آپ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ ہو جائے جو صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع حدیث میں شہرت رکھتے تھے۔ اول ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی باوجود نوجوان ہونے کے محض ان کے علم قرآن اور حدیث کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اور ایسے معاملات ان سے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ چہارم ضروریات اور نئے پیش آمدہ امور کو الگ چھوڑ کر صحابہؓ تلاش حدیث میں سرگرم رہتے تھے۔ کیونکہ

وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی الفاظ آئندہ نسلوں کو پہنچنے سے رہ جائیں۔ چنانچہ جہاں کہیں کسی حدیث کی روایت کا ذکر سنتے تھے فوراً اس جگہ پہنچ کر بعد تحقیق اس حدیث کو اپنے علمی ذخیرہ میں شامل کرکے دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ دراصل صحابہؓ کے زمانہ میں جمع حدیث کے لئے اول ان حدیثوں کی اشاعت ضروری تھی تاکہ عام طور پر معلوم ہو کر وہ حدیثیں محدثین کے ذخیرہ علم میں داخل ہو سکیں۔ پنجم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور ان میں سے بہت سے اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ انہیں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات معلوم ہو جائیں جس کے زمانہ کو پا کر وہ اسلام اور آپ کی صحبت سے محروم رہے۔ ایسا ہی دین اسلام کے متعلق بھی وہ پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور یہی حال اس نئی اسلامی نسل کا تھا جس کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اس قدر ملا ہوا تھا۔ مگر اس مبارک زمانہ کو انہوں نے نہ پایا تھا۔ یہ تمام لوگ اس تلاش میں رہتے تھے کہ کسی صحابی سے مل کر اس سے حالات سنیں اس ذریعہ سے حدیث کا علم اور بھی اشاعت پاتا رہا۔ پھر جوں جوں صحابہؓ دنیا سے گذرتے گئے ان لوگوں کا اشتیاق احادیث کا علم حاصل کرنے اور ان کو محفوظ رکھنے اور پھیلانے کا اور بھی بڑھتا گیا۔ ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اکثر وہ احادیث جو صحابہؓ کے علم میں تھیں تابعین کو پہنچ گئیں۔ ششم وہ صحابی جن کے پاس احادیث کا ذخیرہ زیادہ تھا۔ جیسے ابوہریرہ انسؓ بن مالک ابن عباسؓ وغیرہ وہ تدریس کے طور پر مشتاق طالبعلموں کو حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ اور صحابہؓ کے زمانہ میں ہی ایسے مقامات پر حدیث کی بڑی بڑی درسگاہیں بن گئی تھیں۔ جہاں باقاعدہ حدیث کی اشاعت ہوتی تھی اور دور دور سے سننے والے جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ آٹھ سو آدمی حضرت ابوہریرہؓ کے حدیث میں شاگرد تھے۔ ان درسگاہوں کا قائم ہونا جمع حدیث کے دوسرے مرحلہ کا اختتام تھا اور یہی تیسرے مرحلہ کی ابتدا تھی۔

جمع حدیث کا تیسرا مرحلہ زمانہ تابعین اور درسگاہوں میں تدریس حدیث

تیسرا مرحلہ جمع حدیث میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب صحابہؓ کا زمانہ گذر کر کل احادیث اکابر تابعین کے ہاتھ میں آ چکی تھیں۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے کل صحابہؓ اس دنیا سے گذر چکے تھے۔ حدیث کی درسگاہیں صحابہ کے زمانہ میں ہی قائم ہو چکی تھیں۔ اور اب اس تیسرے مرحلہ پر جمع حدیث کے لئے اس طرح پر تلاش کی ضرورت نہ رہ گئی تھی جیسے صحابہ کے وقت میں تھی۔ کیونکہ صحابہؓ کے زمانہ تک نئی نئی احادیث اشاعت پاتی رہتی تھیں مگر اب صرف وہی احادیث آگے پہنچائی جاتی تھیں جو صحابہؓ کے ذریعہ تابعین کو پہنچ چکی تھیں۔ پس عموماً حدیث کی تلاش ان درسگاہوں تک ہی محدود ہو گئی تھی۔ جہاں علم حدیث کا چرچا ہوتا تھا۔ اور بہت کم ایسی حدیثیں تھیں جو ان درسگاہوں میں نہ آ گئی

ہوں۔ اس طرح پر جہاں تک زبانی سلسلہ روایت کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ ان درسگاہوں کے قائم ہونے اور ان میں علم حدیث کے پڑھایا جانے سے جمع حدیث کی ایک گونہ تکمیل ہو چکی تھی لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ کسی ایک درسگاہ میں کل کی کل حدیثیں مل سکتی تھیں بلکہ جو احادیث کسی محدث یا تابعی نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سن کر حفظ کر لی تھیں۔ انہی احادیث کی اشاعت اس درسگاہ میں ہوتی تھی۔ اور پھر سفر کے ذریعہ محدثین کے علم کی وسعت ہوتی رہتی۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں حدیث کا لکھنا پہلے کی نسبت زیادہ مروج ہو گیا تھا۔ اور جہاں محدثین درسگاہوں میں سنایا کرتے تھے بہت لوگ ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ اور جو حافظہ پر پورا بھروسہ کر سکتے تھے وہ ان کو وہیں یاد کر لیا کرتے تھے۔ امام زہری (جو ۵۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ ہجری میں وفات پائی) کی تالیفات کے متعلق لکھا ہے کہ گدھوں اور گھوڑوں پر لاد کر لائی گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب یہ احکام نافذ کئے تھے کہ احادیث لکھ لی جایا کریں اور علمائے حدیث حدیثوں کی تدریس کے سلسلہ کو وسیع کریں تاکہ جو لوگ علم حدیث سے واقف نہیں وہ بھی واقف ہو جائیں تا اس طرح پر سلسلہ روایت حدیث اور جمع حدیث میں کوئی خلل نہ آئے۔ ایسا ہی آپ نے عمرہ کے مسائل جو حضرت عائشہؓ سے مروی تھے لکھوائے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں حدیثیں صرف متفرق طور سے لکھ لی جایا کرتی تھیں۔ وہ کتابوں کی صورت میں نہ تھیں۔ نہ تحریر کے ذریعہ ان کی اشاعت ہی ہوتی تھی۔ بہر حال حدیث کا لکھنا عام طور پر مروج ہو گیا تھا۔ اور یہ تیسرے مرحلہ کا اختتام تھا اور یہی چوتھے مرحلہ کی ابتدا تھی

جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ حدیث پر تصنیفات

دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب حدیث کے لکھا جانے نے ایک اور رنگ پکڑ لیا اور بجائے متفرق مسودات کے جن کی اشاعت بحیثیت ایک کتاب ہونے کے نہ ہو سکتی تھی مستقل کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہو گئیں۔ اس زمانہ تک محض تحریری مسودہ اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی نہ تھا کہ واقعی ایک حدیث صحیح اور قابل اعتبار ہے۔ بلکہ یہ ضروری تھا کہ معتبر سلسلہ رواۃ سے حدیث کو کسی مشہور صحابی تک پہنچایا جائے۔ اور ان تمام راویوں کے نام درجہ بدرجہ ظاہر کئے جائیں جن کے ذریعہ حدیث اس بیان کرنیوالے تک پہنچی تھی۔ اس لئے ان کتابوں میں بھی پورا پورا سلسلہ راویوں کا دیا جاتا تھا۔ یہ کتابیں اشاعت کے بعد یہ وقعت رکھتی تھیں کہ ان کی احادیث کا حوالہ دیا جائے۔ کیونکہ اس زمانہ میں تحریر کا رواج عام ہو کر کتابوں کے نسخے کثرت سے شائع ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے حدیث کی کتاب لکھی وہ امام عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج تھے جو ابن جریج کے نام سے مشہور ہیں۔ اور بعض کے نزدیک سب سے پہلے حدیث کی کتاب

ربیع بن صبیح نے لکھی۔ اور تیسری روایت ہے کہ سب سے اول سعید ابن ابی عروبہ تھے۔ یہ تمام محدثین دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب فوت ہوئے جس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حدیث کا کتابوں میں لکھا جانا دوسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ انکے بعد حدیث کے بڑے معتبر امام حضرت امام مالک بن انس رضؓ تھے جن کی کتاب مؤطا آجتک حدیث میں سند مانی گئی ہے۔ یہ کتاب اہل حجاز کی احادیث پر مبنی تھی۔ اور علاوہ احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس میں صحابہؓ اور تابعین کے اقوال اور فتاوی بھی درج ہیں۔ مختلف مقامات میں مختلف ائمہ حدیث نے اس زمانہ میں کتابیں لکھیں چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں۔ امام مالکؒ نے مدینہ میں۔ سفیان بن عیینہ نے بھی مدینہ میں عبداللہ بن وہب نے مصر میں معمر اور عبدالرزاق نے یمن میں۔ سفیان الثوری۔ اور محمد بن فضیل نے کوفہ میں حماد بن سلمہ اور روح بن عبادہ نے بصرہ میں ہشیم نے واسط میں اور عبداللہ بن مبارک نے خراسان میں حدیث پر کتابیں تصنیف کیں ۔

پانچواں مرحلہ جمع حدیث کے کام کی تکمیل

یہ تصنیفات جن کا ذکر اوپر ہوا جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ ہیں۔ اصل میں تدوین حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی تک یہ کام تکمیل کے درجہ کو نہیں پہنچا تھا۔ چوتھے مرحلہ پر جس قدر تصانیف لکھی گئیں ایک تو انکے اغراض محدود تھے یعنی ان میں ہر قسم کی احادیث نہ پائی جاتی تھیں۔ صرف خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر یہ تالیفات کی گئی تھیں اور دوسرا ان میں وہی احادیث ان مضامین کے متعلق جمع کی گئی تھیں جو ایک خاص حصہ ملک میں مروج تھیں۔ مثلاً مؤطا کو ہی لو اس میں صرف اہل حجاز کی احادیث ہیں اور ان میں سے بھی صرف وہ احادیث جو عمل کے متعلق ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے احکام کے متعلق اور اس قسم کی احادیث جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے متعلق یا مغازی کے متعلق یا تفسیر قرآن کے متعلق وہ اس میں جمع نہیں کی گئیں۔ پس باوجود تدوین کے شروع ہو جانے کے جمع حدیث کا کام ابھی کمال کو نہ پہنچا تھا بلکہ یہ کمال اسے پانچویں مرحلہ پر حاصل ہوا۔ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمع حدیث کا کام شروع کیا اور اس کو ہر پہلو سے مکمل کر کے دکھایا امام محمد بن اسماعیل جو بخاری کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ بخارا ان کا اصل وطن تھا۔ اس وقت کے قریب قریب پیدا ہوئے جو امام مالک کی وفات کا وقت تھا۔ اور جمع حدیث کا شوق ان کو چھوٹی عمر میں پیدا ہو گیا۔ اور تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں یہ کام انہوں نے شروع کر دیا۔ اور کتاب صحیح بخاری تالیف کی ان کی وفات ۲۵۶ھ ہجری میں ہوئی یعنی تیسری کے نصف کے قریب۔ ایسا ہی اس زمانہ کے قریب ان کے شاگرد مسلم نے جمع حدیث کا کام شروع کیا۔ اور صحیح مسلم کو تالیف کیا جس کا مرتبہ صرف صحیح بخاری سے دوسرے درجہ پر ہے۔ پھر ابو داؤد ترمذی اور نسائی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا یہ تینوں کتابیں اگرچہ مؤطا صحیح بخاری اور مسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچتیں مگر ان سے دوسرے

درجہ پر معتبر کتابیں سمجھی گئی ہیں۔ ان کے مصنفوں نے ہر ایک جگہ خود سفر کر کے کل احادیث معتبر کو جمع کیا۔ اور اپنی ساری ساری زندگیاں اسی کام کیلئے وقف کر دیں۔ یہ پانچواں مرحلہ جمع حدیث کا تھا۔ جب یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا اور معتبر احادیث کا ذخیرہ کتابوں کی صورت میں جمع ہو گیا۔

ان پانچوں مرحلوں کے بغیر جمع حدیث کا کام نامکمل رہتا

اس تمام بحث سے یہ امر واضح ہو گیا کہ جمع حدیث کی بنیاد تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی رکھی گئی تھی مگر اس عمارت کی تکمیل امام بخاری رحؒ کے ہاتھ سے ہوئی۔ اور اگر حدیث کی اصلیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بغیر ان پانچ مرحلوں سے گزرنے کے یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکتا تھا۔ یہ پانچ مرحلے در اصل پانچ سیڑھیوں کی طرح تھے۔ اور ہر ایک مرحلہ گویا دوسرے مرحلہ کے لئے تیاری کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ سب سے اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ بعض صحابہؓ نے خصوصیت سے حفظ حدیث کا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر بہت سی احادیث ایسی تھیں جن کا علم خاص خاص صحابہ رضؓ کو تھا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ موقعہ پیش آیا کہ ایسی تمام احادیث عام اشاعت پا گئیں۔ اور خاص خاص لوگوں نے انہیں محفوظ کر لیا۔ دوسری طرف جن صحابہ کو زیادہ حدیثیں یاد تھیں انہوں نے اس زمانہ میں بذریعہ تدریس یہ احادیث آئندہ نسل کو پہنچانی شروع کیں اور جہاں جہاں صحابہؓ پھیل گئے تھے اس جگہ تدریس حدیث کے مرکز قائم ہو گئے۔ اس کے بعد تیسرا زمانہ تابعین کا آیا۔ جب حدیث کے علم کا بذریعہ تدریس عام رواج ہو گیا۔ اور مزید برآں علاوہ حفظ حدیث کے اس کی یادداشتیں لکھی جانی شروع ہو گئیں اور یادداشتوں کی صورت میں نہ کتابوں کی صورت میں حدیث کی تحریر کا رواج عام ہو گیا۔ اور جو لوگ جمع حدیث کے مشتاق تھے وہ ان درسگاہوں میں حاضر ہو کر جب حدیثوں کو سنتے تو ان میں سے اکثر ان کو ضبط تحریر میں لے آتے۔ اس تحریر کے رواج سے جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ آپہنچا۔ جب بجائے الگ الگ یادداشتوں کے کتاب کی صورت میں ترتیب پا کر حدیثوں کا لکھا جانا شروع ہو گیا پھر اس کے بعد پانچواں مرحلہ آپہنچا۔ جب بجائے ایک خاص مقام سے حدیثیں جمع کرنے کے یا بجائے ایک خاص مضمون پر حدیثیں جمع کرنے کے جامع کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہوئیں۔ اس طرح دو سو سال کے عرصہ میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی۔ اور جمع حدیث کا کام ختم ہوا۔ لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کام کی تکمیل فی الفور نہیں ہوئی۔ اور ایک دراز عرصہ اس میں خرچ ہوا۔ حدیثوں کی بے اعتباری نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک ایک قدرتی ترقی تھی۔ جس کے سوائے یہ کام احسن طور پر سر انجام نہ پا سکتا تھا۔ اور یہ پانچوں مرحلے ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں۔

پانچواں باب

تنقید حدیث

میور اور سپرنگر کی رائے محدثین کی تنقید حدیث پر

اب میں اس بات کو لیتا ہوں کہ تنقید حدیث کس حد تک محدثین نے کی اور کس حد تک ہم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلے سوال اول کو لیتا ہوں۔ میور سپرنگر اور معترضین نے ان کتابوں میں معتبر احادیث کے ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان محدثین نے حدیث کے جمع کرنے میں تنقید کا طریق اختیار نہیں کیا۔ میور سپرنگر کی رائے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اور خود اسی رائے کا مؤید ہے۔ بخاری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "جن اصول اور قواعد کی پیروی اس نے (یعنی امام بخاری علیہ الرحمۃ نے) کی۔ ان پر تنقید کا نام چسپاں نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا تھا کہ راویوں کا سلسلہ پورا ہے یعنی منقطع نہیں ہو جاتا۔ اور ان راویوں کے چال چلن کو دیکھ لیتا تھا۔ اور چونکہ ایک قاعدہ اس نے یہ بھی مقرر کیا ہوا تھا کہ جو حدیث اس کے اپنے متعصبانہ خیالات کے مطابق نہ ہو اسے رد کر دیتا تھا۔ اس لئے اس کے کسی حدیث کو رد کر دینے سے یہ نتیجہ کسی صورت میں نہیں نکل سکتا کہ وہ حدیث واقعی ناقابل اعتبار ہے مگر اس کی جامع دوسری سندوں سے یہ امتیاز ضرور رکھتی ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کا پیرو نہ تھا۔ بلکہ صرف حدیثوں کی فرضی صحت اور راویوں کی راستبازی وغیرہ پر ہی سارا دارومدار رکھا کرتا تھا"۔ ایسا ہی میور اپنے دیباچہ لائف آف محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتا ہے۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ محدثین کسی قسم کی تنقید کو کام میں لاتے تھے اور وہ بھی ایسی سختی سے کہ بحساب اوسط ہر سو حدیث میں سے انہوں نے قریباً ننانوے کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے۔ لیکن یورپین ناظرین سخت دھوکا کھائیں گے اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ تنقید باوجود اس قدر سختی کے صحیح معنوں میں ایک کامل اور صحیح تحقیقات احادیث کی صحت کے متعلق تھی۔ محدثین کے نزدیک کسی حدیث کے قابل اعتبار ہونے کے لئے اس حدیث کے نفس مضمون کو نہ دیکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان ناموں کو دیکھا جاتا تھا جو اس حدیث کے بیان کرنیوالے ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح احادیث کی سند پہلے کسی صحابی سے چلنی چاہئے اور پھر راویوں کے ایک لمبے سلسلے میں ہر ایک راوی کی صداقت پر اس کی بنا ہوتی تھی۔ اگر ان راویوں کی

صداقت پر کوئی الزام عائد نہ ہو سکے۔ تو حدیث قبول کرنی چاہئے نفس مضمون میں کوئی بات خواہ کیسی ہی بعید از قیاس کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ وہ ایسی حدیث کے اعتبار کو نہیں گرا سکتی۔ محدثین بحر تنقید میں کھلی کھلی شناوری نہ کرتے تھے بلکہ اس ایک ہی قاعدہ کے غلام ہو گئے تھے۔ اندرونی شہادت پر جرح کرنے کی ان کو قطعاً جرأت نہ تھی"۔

محدثین کے قرارداد اصول تنقید حدیث

یہ دو ایسے شخصوں کی رائے ہے جن کی رائے کو اسلام کے متعلق نہایت محققانہ اور بے لوث مانا گیا ہے مگر میں افسوس سے کہتا ہوں کہ ان خیالات کے ظاہر کرنے میں ان دونوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جن احادیث کو محدثین نے وضعی قرار دیا ہے۔ ان کو کس بنا پر وضعی قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محدثین نے راویوں کے متعلق پوری پوری تحقیقات کرنے میں بہت ہی کوشش کی ہے۔ اور میں یہ ثابت کروں گا کہ احادیث کی صحت کو پرکھنے کے لئے اسکی ضرورت تھی مگر یہ غلط ہے کہ انہوں نے اندرونی شہادت پر مطلق توجہ نہیں کی۔ بلکہ احادیث موضوعہ کے جانچنے کے لئے جو اصول انہوں نے مقرر کئے ہیں وہ قریباً سب کے سب اندرونی شہادت کے ہی متعلق ہیں چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے عجالہ نافعہ میں وضعی احادیث کی مفصلہ ذیل علامات بیان کی ہیں جنہیں نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں ذکر کیا ہے۔ وہ علامات حسب ذیل ہیں۔ اوّل یہ کہ روایت تاریخ کے خلاف ہو۔ جیسا کہ کہا جائے کہ عبداللہ بن مسعود نے جنگ صفین میں یوں فرمایا حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں وفات پا چکے تھے۔ دوم یہ کہ راوی رافضی ہو اور جو حدیث وہ بیان کرے وہ صحابہ کے مطاعن میں ہو۔ یا راوی خارجی ہو۔ اور اہل بیت کے مطاعن میں حدیث بیان کرے علیٰ ہذا القیاس۔ پھر اگر راوی اس حدیث کو بیان کرنے میں اکیلا ہو اور اور کوئی راوی اس حدیث کا نہ ہو تو ایسی حدیث منکر ہے۔ اور اگر اور لوگ بھی اس حدیث کو بیان کرنیوالے ہوں تو حدیث قبول کی جائے اور اس کی مناسب توجیہ کی جائے۔ سوئم ایسی حدیث بیان کرے جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا سب مکلفوں پر واجب ہو۔ اور راوی اس حدیث کے بیان کرنے میں اکیلا ہو۔ تو یہ مضبوط قرینہ حدیث کے جھوٹا اور موضوع ہونے پر ہے۔ چہارم یہ کہ راوی کا حال اور وہ وقت جب حدیث کو بیان کیا ہے اس کے کذب پر قرینہ ہوں۔ جیسا کہ خلیفہ عباس مہدی کی مجلس میں غیاث بن میمون کیلئے واقع ہوا کہ جب وہ بادشاہ کے پاس حاضر ہوا تو بادشاہ اس وقت کبوتروں کے اڑانے میں مشغول تھا۔ جس پر غیاث نے بادشاہ کو خوش کرنے کیلئے یہ حدیث سنائی کہ لا سبق الا فی خف او نصل او جناح یعنی کوئی شرط نہیں ہونی چاہئے مگر اونٹوں (یا گھوڑوں) کی دوڑ میں۔ اور

تیر اندازی میں اور جانوروں کے اڑانے میں مگر یہ لفظ جناح (پرندوں کا اڑانا) اصل حدیث میں موجود نہ تھا بلکہ غیاث نے صرف خلیفہ کو خوش کرنے کے لئے اسے بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کو کبوتر اڑانے کا شوق تھا۔ پنجم یہ کہ حدیث عقل اور شرع کے مقتضیٰ کے مخالف ہو۔ اور قواعد شرعیہ اس کو جھوٹا ٹھہراتے ہوں۔ جیسا کہ قضائے عمری اور حدیث مثل اس کے کہ لا تاکلوا البطیخ حتٰی تذبحوہ یعنی خربوزے کو نہ کھاؤ جب تک اسے ذبح نہ کر لو۔ ششم یہ کہ حدیث میں کوئی قصہ کسی ایسے امر محسوس کے متعلق ہو کہ اگر درحقیقت وہ واقع ہوا ہوتا تو لاکھوں انسان اس کو نقل کرتے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں خطیب کو جمعہ کے دن ممبر پر قتل کر دیا گیا اور اس کی کھال اتار دی گئی اور اس واقعہ کو سوائے اس راوی کے اور کوئی بیان کرنے والا نہ ہو۔ ہفتم یہ کہ حدیث میں لفظ اور معنی رکیک ہوں مثلاً الفاظ ایسے ہوں جو قواعد عربیہ کے مطابق نہیں یا معنی ایسے ہوں جو شان نبوت اور وقار رسالت کے شایاں نہیں ہشتم یہ کہ چھوٹے سے گناہ پر سخت وعید میں یا تھوڑے عمل پر بڑے ثواب کے وعدوں میں افراط کا پہلو اختیار کیا گیا ہو۔ جیسے من صلی رکعتین فلہ سبعون الف دار فی کل دار سبعون الف بیت فی کل بیت سبعون الف سریر علی کل سریر سبعون الف جاریۃ یعنی جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس کے لئے بہشت میں ستر ہزار مکان ہوں گے۔ ہر مکان میں ستر ہزار کمرے ہوں گے ہر کمرے میں ستر ہزار تخت ہوں گے ہر تخت پر ستر ہزار لونڈیاں ہوں گی۔ بلکہ اس قسم کی کل حدیثیں خواہ وہ ثواب کے بارہ میں ہوں اور خواہ عذاب کے موضوع سمجھی گئی ہیں۔ نہم یہ کہ چھوٹے سے عمل پر عمرہ اور حج کا ثواب بتایا گیا ہو۔ دہم یہ کہ نیکی کرنیوالے کے لئے کئی انبیاء اور مرسلین کے ثواب کا وعدہ ہو۔ یازدہم یہ کہ خود وضع کرنے والا اقرار کرے جیسا نوح بن عصمہ کے لئے اتفاق ہوا کہ اس نے قرآن شریف کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں جھوٹی حدیثیں بنائیں اور ان کو رواج دیا اور شہرت دی جیسا کہ بیضاوی میں ہر ایک سورۃ کے آخیر میں ان کا ذکر ہے اور جب محدثین نے ان حدیثوں کے متعلق تحقیق شروع کی اور اسے کہا کہ ان کی سند کو صحت کو پہنچائے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حدیثیں کہاں سے لیں تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے خود ہی یہ جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں۔

محدثین نے اندرونی شہادت اور قرائن سے کام لیا

اب معترضین اس مقام پر غور کریں کہ ان گیارہ علامتوں میں سے جو وضعی احادیث کیلئے قرار دی گئی ہیں۔ دس علامتیں اندرونی شہادت اور قرائن کے متعلق ہیں۔ حالانکہ میور اور سپرنگر صاحبان جن کو بڑے محقق ہونے کا دعویٰ ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ محدثین کو یہ جرأت ہی نہ تھی کہ وہ قرائن کی شہادت پر یا اندرونی شہادت پر تنقید کریں اس سے بڑھ کر ان لوگوں کی جہالت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ جس آزادی کے ساتھ محدثین نے احادیث پر تنقید کی ہے۔ اس کی نظیر ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان کے

نزدیک دنیوی وجاہت کوئی قابل توجہ چیز نہ تھی۔ بلکہ بڑے سے بڑے آدمی کے چال چلن پر وہ اسی طرح تنقید کرتے جیسے معمولی آدمی پر اور جب اُن پر یہ ثابت ہو جاتا کہ ایک شخص نے عمداً ایک لفظ بھی جھوٹا حدیث میں ڈال دیا ہے تو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا مگر اس کی روایت کو وہ ہرگز نہ لیتے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ قرائن کی شہادت اور اندرونی شہادت پر محدثین نے اسی طرح سے تنقید کی جیسے راویوں کے حالات وغیرہ کے متعلق۔ اور یوں حدیث کو بلحاظ صحت ایسے مرتبہ پر پہنچایا جو عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو بھی میسر نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے قبول کرنے میں نہ بڑے روایت کوئی تنقید کی گئی اور نہ بڑے درایت۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں محدثین نے راویوں کی جرح اور تعدیل میں اس قدر کوشش کی ہے اور اس سے حدیث کی صحت کے متعلق کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں ؟

روایت کی تنقید مزید احتیاط کے لئے تھی

جاننا چاہیے کہ محض اندرونی شہادت یا قرائن کی شہادت پر کوئی جرح وارد نہ ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ حدیث واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کیونکہ بہتیری احادیث ایسی وضع ہو سکتی تھیں اور ہوئیں جن کا مفہوم مخالف عقل نہ تھا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ ایک بات مخالف عقل نہیں یہ سند نہیں ملتی کہ وہ بات واقعی صحیح بھی ہے اور اس کے راوی نے سچ بیان کیا ہے کیونکہ ہر ایک جھوٹی بات مخالف عقل نہیں ہوتی بلکہ جن لوگوں کو آجکل عدالتوں میں شہادتوں کے سننے کا اتفاق ہوا ہوگا وہ جانتے ہیں کہ جھوٹی شہادتیں اس قدر احتیاط سے دی جاتی ہیں کہ قرائن اور اندرونی شہادت کی رو سے وہ سچی شہادت سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اور ہزارہا مقدموں کا لائق جج انہیں شہادتوں پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس لئے محدثین نے وہی طریق اختیار کیا جو ہر ایک محقق منتقد کو اختیار کرنا چاہیے یعنی جب انہوں نے دیکھا کہ ایک حدیث قرائن اور اندرونی شہادت سے وضعی ثابت نہیں ہوتی تو انہوں نے اتنی بات پر اکتفا کر کے اسے سچ نہیں سمجھ لیا۔ اور اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا۔ بلکہ پھر پورا زور اس امر کی تحقیق پر لگایا کہ وہ لوگ جن کی روایت سے وہ حدیث ان تک پہنچی ہے کس قسم کے لوگ ہیں۔ آیا وہ ایسے لوگ ہیں جن کی سچائی اور راستبازی اور ان کے حافظہ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یا ان کا جھوٹ بولنا یا اکثر غلطی کرنا وغیرہ امور ثابت ہیں۔ جن سے ان کی باتیں بھی قابل اعتبار نہیں رہ جاتیں جن مراحل کو طے کر کے حدیث صحابہؓ سے اس زمانہ کے محدثین تک پہنچی تھی جب کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں ان پر نظر کر کے ضروری تھا کہ جامعین حدیث راویوں کے معتبر یا غیر معتبر یا معروف یا مجہول الحال ہونے پر پوری بحث کرتے اور بغیر اس بحث کے وہ کبھی صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکتے تھے ؟

علاوہ ازیں علم جرح (گواہ کو بے اعتبار ثابت کرنا) اور تعدیل (اس کو صادق اور قابل اعتبار

علم جرح اور تعدیل کی بنیاد ابتدا سے رکھی گئی

ثابت کرنا، جو علم حدیث کی ایک نہایت ضروری فرع ہے۔ اس کی بنیاد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پڑ چکی تھی۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اجازت دی تھی کہ شہادت کے پرکھنے کے لئے گواہ کے چال چلن کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے اور قرآن کریم بھی فرماتا ہے کہ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا یہ تو صحابہؓ کے زمانہ کا حال تھا۔ اور جب تابعین کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو اس زمانہ میں ہر راوی کے متعلق جرح اور تعدیل کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں مشہور محدث اور امام حدیث یحییٰ بن سعید بن قطان اور شیبہ بن حجاج نے اس علم کے متعلق تحقیقات کر کے واقعات کو جمع کیا۔ اس تحقیقات میں جو رجال حدیث کے متعلق کی جاتی تھی کسی شخص کو باہر نہ چھوڑا جاتا تھا۔ بلکہ ہر ایک کی صداقت اور اس کے چال چلن اور اس کی قوت ضبط وغیرہ کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ اور یہ کسی صورت میں ممکن نہیں کہ اگر تابعین کو یا ان کے بعد آنے والی نسلوں کو ایک صحابی کے متعلق بھی کسی حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو جاتا۔ تو وہ صحابہؓ پر وہی جرح نہ کرتے جو دوسروں پر انہوں نے کی۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ خود صحابہؓ کو اور پھر ان سے بعد ہر ایک نسل کو یہ یقین کامل تھا کہ کسی صحابی نے عمداً کوئی جھوٹی حدیث بنا کر مشہور نہیں کی۔ اور اسی لئے تمام محققین کا اس بات پہ اتفاق ہو گیا کہ صحابی پر جرح کی ضرورت نہیں بلکہ جب ایک حدیث ایک مشہور صحابی تک راویوں کے معتبر سلسلہ سے پہنچ جائے۔ تو پھر اسے صحیح اور قابل اعتبار مان لیا جائے۔ اگر یہ خصوصیت صحابیوں کو نہ ہوتی کہ ان میں کسی نے کوئی حدیث جھوٹی نہیں بنائی تو محدثین ان کو بھی علم الجرح والتعدیل کے نیچے اسی طرح لاتے جس طرح وہ تمام دوسرے راویان حدیث کو لائے۔

کن حالات میں روایت کو قبول نہ کیا جاتا تھا

اس تمام بحث سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی نے کبھی کوئی حدیث وضع نہیں کی۔ پس محدثین صرف انہی حدیثوں کو لیتے تھے جن کی روایت معتبر راویوں کے ذریعہ کسی مشہور صحابی تک پہنچے۔ اور ان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ دیکھیں کہ آیا جن لوگوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ اعتبار کے قابل گواہ ہیں یا نہیں۔ جن مراحل کو طے کر کے علم حدیث دوسری صدی ہجری کے آخر پہنچ گیا تھا۔ ان سے یہ تحقیقات آسان ہو گئی تھی۔ کیونکہ ہر ایک عالم پر جو ائمہ حدیث حدیث کو لیتے اور پھر اُسے آگے پہنچاتے تھے وہ پچھلے راویوں کو جرح و تعدیل کے ماتحت لانے کے بعد اور اس بات کو سمجھ کر کہ واقعی یہ حدیث قابل اعتبار ہے اسے قبول کرتے اور آگے پہنچاتے تھے۔ علاوہ ازیں ابتدائی زمانہ تابعین میں ائمہ حدیث جو حدیث کے محافظ اور سکھلانے والے تھے تھوڑے اور مشہور آدمی تھے۔ اور ان کے حالات صدق اور حفظ وغیرہ کے متعلق بھی مشہور تھے۔ کیونکہ وہ پہلے زیر تنقید آ چکے تھے۔ اس لئے محدثین نے جب دوسری صدی ہجری کے اخیر پر حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع

کیا تو انہوں نے سب سے پہلی یہ احتیاط کی کہ جس راوی کے حالات معلوم نہیں اس کی حدیث کو قبول نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس کے صدق پر یا حافظہ پر کوئی جرح نہ ہو سکتی تھی۔ ایسے ہی اور بھی کئی ایک قواعد اس علم کے انہوں نے مقرر کئے۔ جن سے راوی کے اعتبار کا اندازہ کیا جاتا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کوئی حدیث عمداً وضع کی ہے تو ایسے شخص کی روایت کو بالکل ناقابل اعتبار مانا جاتا۔ ایسا ہی اگر کسی راوی کے متعلق معلوم ہو کہ وہ حدیث کی روایت میں اکثر غلطی کرتا ہے تو اس کا ضبط اور حافظہ ناقابل اعتبار مانے جاتے راوی کی صداقت اور اس کی راستبازی کو خصوصاً بہت باریک نظر سے تحقیق کیا جاتا۔ ایسا ہی یہ بھی دیکھا جاتا کہ آیا ایک شخص جو روایت کرتا ہے اس کا اس شخص سے جس سے وہ روایت کرتا ہے ملنا بھی ممکن تھا یا نہیں۔ بلکہ جن محدثین نے اس سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے انہوں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ واقعی ایک کے دوسرے سے ملنے کا ثبوت ہونا چاہئے اور بغیر اس کے حدیث قبول نہیں کی جائیگی چنانچہ امام بخاری رح نے اپنی تحقیقات میں اس بات کو ضروری سمجھا ہے۔ ایسا ہی راوی کے حافظہ وغیرہ کے متعلق شہادت لی جاتی۔ ان اصول اور قواعد کی رُو سے راوی اور اس کی روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ تحقیق و تنقید کا پہلو جو محدثین نے اختیار کیا کس قدر مشکل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ سارے سامان جن کے ذریعے یہ عظیم الشان تحقیق اور تنقید کا کام تکمیل کو پہنچ سکتا تھا پہلے سے موجود تھے۔ کیونکہ جمع حدیث کے ہر مرحلہ پر انہی تمام اصول اور قواعد سے کام لیا گیا تھا اور جس طرح علم حدیث ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم تنقیدی بھی پہنچتے رہے۔ صحابہؓ اور تابعین کے زمانہ میں ائمہ حدیث کی تعداد ایسی زیادہ نہ تھی اور ان کے حالات بھی مشہور و معروف تھے۔ البتہ بعد کے زمانہ میں حدیث کے راویوں اور حدیث کے علم کو پھیلانے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ پس جس قدر ان سب لوگوں کے حالات کا معلوم کرنا مشکل تھا۔ اسی قدر قرب زمانہ کے سبب سے اس میں آسانی بھی تھی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ کے محدثین نے بجائے خود احادیث کو پوری تنقید اور تحقیق کے بعد قبول کیا۔ اور پھر اپنے شاگردوں کو حدیث سکھانے کے علاوہ یہ تنقیدی علوم بھی سکھائے۔ پس حدیث کے ساتھ ساتھ ہی ہر مرحلہ پر تنقیدی علوم متعلقہ حدیث بھی جمع ہوتے چلے گئے۔ اور میں یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ تابعین کے زمانہ میں بھی علم جرح و تعدیل کے امام پائے جاتے تھے جنہوں نے اس علم کے متعلق واقعات کو تحقیق اور جمع کیا پس اگرچہ ان محدثین کی راہ میں جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں حدیث کو کتابوں میں لکھنا

شروع کیا بہت سی مشکلات تھیں۔ مگر یہ مشکلات ایسی نہ تھیں جن کا حل کرنا محالات سے ہوتا بلکہ اُن کے حل کرنے کے سامان بھی ساتھ ہی موجود تھے۔

محدثین نے ایک دوسرے سے آزاد رہ کر تنقید کی

ایک اور اعتراض جو میور نے کیا ہے یہ ہے کہ محدثین کو ایک دوسرے کی تحقیق پر کوئی اعتبار نہ تھا کیونکہ ہر ایک محدث نے اپنے اپنے طریق سے تخریج احادیث کی ہے۔ گویا اپنے سے پہلے محدث کی تحقیق کو اس نے درست نہیں سمجھا۔ عیب نماید ہنرش در نظر والا معاملہ ہے۔ ان لوگوں نے اسلام پر اعتراض کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے اور نہیں سوچتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں ہر محدث کی آزادانہ تحقیق صحت احادیث پر ایک کھلا گواہ ہے۔ مگر پادری صاحبان کے نزدیک یہی اعتراض ہے۔ اگر محدثین آزادانہ تحقیقات الگ الگ نہ کرتے۔ تو پھر یہی لوگ کہتے کہ ایک شخص نے جو حدیثیں جمع کر دیں سب نے اسی کا تتبع کیا۔ اس لئے یہ احادیث قابل اعتبار ہی نہیں۔ کیونکہ صرف ایک شخص کی رائے کی پیروی سب نے کی ہے اور اس سے پادری صاحبان کو یہ کہنے کا موقع بھی ملتا کہ اسلام میں آزادانہ تحقیقات کی رُوح ہی نہیں ہے۔ لیکن جب ایسی تحقیق کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الگ الگ راہوں پر چل کر کل محدثین ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ تو اب پادری صاحبان کہتے ہیں کہ محدثین کو ایک دوسرے کی صداقت کا اعتبار نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ محدثین کے اس طریق سے ہمیں صحت حدیث پر بڑی بھاری دلیل ملتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ اختلاف باہمی اعلیٰ طبقہ کے محدثین میں ہیں وہ بمقابلہ متفقہ احادیث کے کچھ بھی نہیں۔ بس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ احادیث کے مجموعے قابل اعتبار ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ جن احادیث پر دو دو تین تین چار چار محدثین کا اتفاق ہو گیا ہے ان کی صحت میں عموماً کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں مختلف آدمیوں کا اپنے اپنے طور پر تحقیقات کر کے سب کا ایک ہی بات پر متفق ہو جانا اس بات کی صحت پر ایک بڑی بھاری شہادت ہے۔ مثلاً جو کتابیں دوسری صدی ہجری کے نصف میں لکھی گئیں اور جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں وہ بھی ایک دوسرے کی تائید ہی کرتی ہیں اور سوائے اس کے کہ پچھلی کتابیں جامع ہیں اور کوئی اختلاف ایسا نظر نہیں آتا جس سے احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر کوئی شبہ پڑ سکے۔ بلکہ تمام بڑی بڑی باتوں اور اہم امور میں ان سب کا اتفاق ہے۔

حدیث میں اختلاف

اب جب ہم اختلافات پر غور کرتے ہیں۔ تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں پاتے جس سے حدیث کی صحت پر شبہ وارد ہو سکے بلکہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اختلاف ہوتے اور ان اختلافوں کا ہونا در اصل احادیث کی صحت پر ہی شہادت ہے۔ مثلاً اول تو فروع میں مذہب اسلام نے ایسی سختی نہیں کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی اختلافات فروع میں پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ صرف یہی ہو

سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض فعلوں کو کئی طرح کر کے دکھایا۔ یا بعض امور میں خود ہی رخصت
دی۔ اس کی شہادت کثرت سے احادیث سے ملتی ہے۔ بلکہ جب امام مالکؒ مؤطا لکھ چکے تو خلیفہ ہارون
الرشید نے آپ سے یہ مشورہ کیا کہ مؤطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جاوے اور لوگوں کو یہ حکم دیا جاوے کہ وہ سب
اسی پر عمل کریں جو مؤطا میں لکھا گیا ہے تو امام مالکؒ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ فروع میں
تو صحابہؓ میں بھی اختلاف تھا۔ اور وہ دور دور ملکوں میں پھیل چکے تھے جس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اختلاف
جائز ہیں اور ان اختلافوں کے ہونے سے کسی حدیث کی صحت پر شک نہیں پڑ سکتا۔ ایسا ہی جب خلیفہ منصور
نے امام مالکؒ سے کہا کہ مؤطا کے نسخے سب شہروں میں بھیج دیئے جاویں۔ اور کل لوگوں کو تاکید کی جائے
کہ وہ اس پر عمل کریں۔ تو یہی جواب اس وقت بھی انہوں نے دیا۔ دوسری قسم کے فرق وہ ہیں۔
جو اس وجہ سے اختلاف معلوم ہوتے ہیں کہ یا تو مثلاً دو تصنیفوں کا دائرہ ایک سا ہی وسیع نہیں۔
مثال کے طور پر مؤطا اور صحیح بخاری کو لو۔ صحت کے لحاظ سے یہ دونوں سب سے اعلیٰ طبقہ حدیث کی
کتابیں ہیں۔ مگر مؤطا میں صرف تین سو کے قریب حدیثیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں اڑھائی ہزار سے کچھ
اوپر ہیں۔ اب اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ نے صرف اہل حجاز کی حدیثیں لیں۔ لیکن امام بخاری
نے بلاد و امصار میں پھر کر ہر جگہ سے حدیثیں جمع کیں۔ اور اسی طرح امام مالکؒ نے ہر قسم کی حدیثیں جمع نہیں
کیں۔ اور امام بخاریؒ نے ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور ابوداؤد کی حدیثوں میں بھی
ایک قسم کا فرق پایا جاتا ہے جس کی وجہ وہ قوانین تنقید ہیں۔ جو ہر ایک نے الگ الگ اختیار کئے۔ مثلاً
مسلم کے نزدیک یہ کافی ہے کہ جو راوی حدیث بیان کرتا ہے اس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ جس سے وہ
حدیث بیان کرتا ہے یعنی اس کا شیخ وہ اس کا ہمعصر ہے۔ مگر بخاری رح کے نزدیک اس قدر پر اکتفا کرنا
ٹھیک نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے جس قانون تنقید کی رو سے حدیثوں کو قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ راوی کا
اپنے شیخ سے ملاقات کرنا ثابت ہو۔ اس طرح پر بخاری کے قوانین تنقید دوسرے تمام محدثین کی نسبت
سخت تر تھے اور ان کی پابندی سے حدیث کو جمع کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر چونکہ جس طریق پر امام
بخاری رح حدیثوں کو پرکھتے تھے۔ وہ بہت محتاط طریق تھا۔ اس لئے بخاری کی حدیثیں بھی صحت کی
رو سے افضل ہیں۔ اگرچہ تعداد میں کم ہیں۔ اور جو عام اعتقاد امت محمدیہ کا اس کتاب کے متعلق ہے
کہ یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے وہ بالکل درست ہے۔ ایسا ہی صحیح مسلم۔ ابوداؤد اور ترمذی، نسائی
وغیرہ سے فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ جہاں بخاری اور مسلم صرف ان احادیث کی تخریج کرتے ہیں۔ جن کے
راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر پہلے محدثین کا اتفاق رہا ہو۔ نسائی نے ان حدیثوں کو بھی لے لیا ہے

جن کے راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر اگرچہ اتفاق نہیں مگر ان کے ناقابل اعتبار ہونے پر بھی اتفاق نہیں یعنی کسی نے ان راویوں کو ثقہ مانا ہے اور کسی نے غیر ثقہ ایسا ہی ابوداؤد نے ان ابواب میں جہاں انہیں اعلیٰ طبقہ کی صحیح احادیث نہیں ملیں ضعیف حدیثوں کو لے لیا ہے۔ پس ان مختلف قواعد تنقید کی پیروی سے یہ ضروری تھا کہ بعض حدیثیں جو ایک محدث نے قبول کرلی ہیں۔ دوسرا انہیں قبول نہ کرتا۔ اب ان اختلافات کو چھوڑ کر جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی وہ اختلافات جو فروعی مسائل میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کا ہونا صحابہؓ میں بھی ثابت ہے یا وہ فرق جو بسبب تنگی یا وسعت دائرہ تحقیق کے پیدا ہوئے اور وہ فرق جو بسبب قواعد تنقید میں سختی یا نرمی کے پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو جو کہ دراصل حدیث کی صحت پر ان سے کوئی شبہ وارد نہیں ہوتا۔ الگ رکھ کر باقی جو اختلاف رہ جاتے ہیں وہ برائے نام اختلاف ہیں۔ اور اس طرح پر مختلف محدثین کی اپنی اپنی آزادانہ تحقیقات کا نتیجہ احادیث کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے جس کی صحت میں ایک محقق کو کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا۔

محدثین کا شاہانِ وقت کے اثر کے ماتحت نہ ہونا

ایک اور اعتراض تنقید حدیث کے متعلق جو پادری صاحبان کرتے ہیں یہ ہے کہ محدثین نے طرح طرح کے اثروں سے متاثر ہو کر احادیث کو جمع کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ان بادشاہوں کے اثر سے جن کی حکومت میں جمع حدیث کا کام ہوا۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ کسی خوشامدی نے کسی بادشاہ کے خوش کرنے کیلئے حدیثیں وضع کی ہوں۔ مگر یہ کہنا کہ بخاری اور مسلم جیسے محدثین نے احادیث کو جمع کرتے وقت بادشاہ وقت کا لحاظ کیا۔ اور مضبوط اور صحیح احادیث کو جو بادشاہ کے فوائد کے منافی تھیں۔ رد کر دیا۔ یا کمزور احادیث کو جن سے اس کے فوائد کی تائید ہوتی تھی قبول کر لیا۔ ان راستباز محققین پر سراسر افترا ہے۔ جن محققین نے احادیث کو جمع کیا۔ ان کو قطعاً حکومت کی کوئی پرواہ نہ تھی اور نہ حکومت کے اثر کے نیچے تھے۔ نہ وہ بادشاہوں کے درباروں میں جانے والے تھے۔ اور نہ ان کو یہ خیال تھا کہ ہمارے کسی منصب یا عزت میں فرق آ جائیگا۔ وہ صرف اسی عزت کے خواہاں تھے۔ جو خدا کے ہاں سے سچے متقی کو ملتی ہے۔ جب بخارا کے حاکم نے امام بخاری علیہ الرحمۃ سے یہ درخواست کی کہ اس کے لڑکوں کو شاہی محل میں آکر پڑھایا کریں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں علم فروشی نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے کہا کہ آپ اپنے مکان پر ہی پڑھائیں لیکن دوسرے لوگوں سے الگ کر کے پڑھائیں تو یہ بھی نامنظور کیا اور فرمایا کہ اگر آپ ان کو پڑھانا چاہتے ہیں تو جہاں عام لوگ بیٹھتے ہیں وہیں یہ بھی آجایا کریں۔ چنانچہ جلا وطنی قبول کی مگر اس بات کو قبول نہ کیا کہ علم کو شاہی اثر کے نیچے آنے دیں یا بادشاہی کو علم کے مقابلہ پر کوئی عزت دیں ایسا ہی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن سے

ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کو بادشاہوں کی ہرگز پرواہ نہ تھی اور حدیث کے جمع کرنے میں وہ صرف انہیں قواعد تنقید کے پابند تھے۔ جن کو انہوں نے ضروری سمجھا۔ بلکہ ایک مشہور شاہی قاضی کے متعلق جب انہیں معلوم ہؤا کہ اس نے بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے ایک حدیث میں ایک لفظ بڑھا دیا ہے تو اس کی حدیث کو انہوں نے مطلقاً چھوڑ دیا۔

غلطی کا امکان

باوجودیکہ میور محدثین کے اصول تنقید کو بالکل بے حقیقت ظاہر کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اس قدر سخت تھے کہ ایک سو میں سے ننانوے حدیثوں کو انہی قواعد کی رو سے وہ قبول نہیں کر سکے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر ان اصول کی رو سے جن پر پادری صاحبان کے نزدیک اصول تنقید کا نام چسپاں نہیں ہو سکتا۔ صرف سو میں سے ایک حدیث قبول کی گئی ہے۔ تو پھر ان کے فرضی اصول تنقید کی رو سے تو لاکھ میں سے ایک حدیث بھی قابل اعتبار نہیں ہونی چاہئے۔ دوسری طرف یہ تعجب آتا ہے کہ ان کے یہ خیالی قواعد تنقید جن کے بغیر یورپین دل اور دماغ خوش نہیں ہو سکتا اس وقت کہاں رکھے رہ جاتے ہیں۔ جب اناجیل کے بے سروپا قصوں کو وہ صحیح تاریخ سے بھی بڑھ کر کچھ رتبہ دیتے ہیں حالانکہ ایشیائی قواعد تنقید سے پرکھا جانے پر بھی وہ اس طرح پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ جس طرح نور کے سامنے ظلمت۔ مگر احادیث کے متعلق میور کو خود اقرار ہے کہ "دوسری صدی ہجری میں حدیث میں اکثر حصہ صداقت کا پایا جاتا ہے"۔ تو پھر اگر وہ اکثر حصہ صداقت کا محدثین کی جمع کردہ احادیث میں نہیں تو کیا ان احادیث میں ہے جن کو محدثین نے ناقابل اعتبار سمجھ کر رد کر دیا ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مخالف خواہ کیسا ہی مخالفت پر تلا ہؤا ہو اس قدر حماقت کا دعویٰ کرے گا۔ محدثین نے تاریخی طور پر احادیث کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ ان سے غلطی کا ہو جانا بھی ممکن ہے۔ مگر اتنی بات سے وہ تاریخ کی حیثیت سے گر نہیں سکتیں کیونکہ کسی تاریخ کے متعلق خواہ وہ ان واقعات کے زمانے میں ہی لکھ لی گئی ہو جب ان کا ظہور ہو۔ مگر تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلطی کی آمیزش سے بالکل پاک ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حدیث جسے کئی محدثین نے ناقابل اعتبار سمجھ کر رد کر دیا ہو۔ دراصل صحیح ہو مگر اس کی صحت کا ثبوت اور طرح سے ملنا چاہیئے۔ ایسے امکانوں کی بنا پر کوئی سمجھدار آدمی یہ طریق اختیار نہیں کیا کرتا کہ ہر ایک معتبر اور مستند واقعہ کو فرضی سمجھ لے اور جھوٹے مضمون کو صحیح سمجھ لے۔ بلکہ جہاں اس قدر تحقیق سے ایک کام کیا گیا ہے اس میں اگر کوئی غلطی ہے تو اس کے لئے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی صحیح امر اس سے باہر چھوڑ دیا گیا ہے تو اس کی صحت کا ثبوت دینا چاہئے۔ محدثین نے ہر طرح سے اور پوری پوری نیک نیتی سے اپنی تحقیقات کی ہے اور جن نتائج پر وہ پہنچے

ہیں ان کو آج ہم یہ بات کہہ کر رد نہیں کر سکتے کہ ممکن ہے انہوں نے کوئی غلطی کی ہو۔

بخاری کی فضیلت

تمام حدیث کے مجموعوں میں امام بخاری علیہ الرحمۃ کی کتاب فوقیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ کل اُمت محمدیہ کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے بھی یہ کتاب جمع حدیث کی تکمیل کو پہنچانے میں سب پر مقدم ہے اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بھی سب پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس کو یہ عزت اور شہرت بعد کے زمانے میں ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ امام بخاری کے تمام ہمعصران کی اس تصنیف کی فضیلت کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ انہوں نے احادیث کے لینے میں بہت ہی احتیاط کی تھی۔ مثلاً صحت حدیث کے لئے عام شرط تو صرف اسی قدر تھی کہ راوی مسلم ہو صادق ہو مدلس (یعنی ایک روایت کو دھوکہ دے کر دوسرے کی بیان کرنے والا) نہ ہو مختلط نہ ہو۔ صفات عدالت سے متصف ہو۔ ضابط اور متحفظ ہو سلیم الذہن ہو قلیل الوہم ہو سلیم الاعتقاد ہو لیکن ان سب احتیاطوں کے علاوہ امام بخاریؒ اور بھی کئی طرح کی احتیاطوں سے کام لیتے تھے۔ اگر ایک محدث مثلاً زہری کے شاگردوں کو پانچ طبقوں پر تقسیم کیا جائے تو وہ عموماً صرف سب سے اعلےٰ طبقہ کی روایت کو لیتے یعنی وہ طبقہ شاگردوں کا جس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ یہ زہری کی صحبت میں اکثر رہے ہیں۔ اور سفر و حضر میں انہوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جیسے یونس بن یزید عقیل بن خالد مالک بن انس۔ سفیان بن عیینہ۔ شعیب ابن ابی حمزہ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے راویوں میں غلطی کا احتمال بہت ہی کم رہ جاتا تھا۔ کیونکہ اکثر ساتھ رہنے سے بار بار احادیث کو وہ سنتے تھے۔ اب اگرچہ زہری کے راویوں کا دوسرا طبقہ بھی بلحاظ حفظ و اتقان وغیرہ کے قابل اعتماد ہے لیکن یہ خصوصیت جو طبقہ اول کو حاصل تھی دوسرے طبقہ کو حاصل نہ تھی اس لئے امام بخاریؒ نے طبقہ اول کی ہی روایت لی ہے۔ جو سب سے معتبر طبقہ تھا۔ ایسا ہی امام بخاریؒ نے دوسرے محدثین کی طرح صرف اس قدر ثبوت پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ راوی اپنے شیخ کا ہمعصر ہو۔ بلکہ جب تک راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات کا ثبوت نہ ملے۔ اس وقت تک وہ اس کی حدیث کو قبول نہ کرتے تھے۔

امام بخاری کے اصول تنقید کی سختی

امام بخاری علیہ الرحمۃ کے قواعد تنقید اس قدر سخت تھے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کی دس ہزار حدیثوں کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ مجھے اس کی صداقت پر شبہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ پادری صاحبان مسلمان محدثین کے اصول تنقید پر اپنا اطمینان ظاہر نہیں کرتے۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ اگر کبھی بخاری جیسا ایک انسان عیسائی مذہب میں پیدا ہوتا تو پولوس جیسے آدمی کی شہادت کو وہ ہرگز قبول نہ کرتا۔ کیونکہ پولوس وہ شخص ہے جس نے صریح طور پر عیسائی مذہب کے پھیلانے کے لئے جھوٹ کا بولنا جائز رکھا۔ جیسا کہ وہ

عیسائی بزرگوں کا دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو جائز رکھنا

رومیوں ۳ باب ۷ آیت میں لکھتا ہے "پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کیلئے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے" میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عیسائیوں کے درمیان ایک انسان بھی ایسا منقد اور محتاط نہیں تو ایسا دیانتدار ہی ہوتا۔ جیسا اسلام کے یہ عظیم الشان محدثین تھے۔ تو حضرت مسیح کا مذہب کچھ نہ کچھ ضرور اپنی اصلیت پر رہ جاتا۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے مسیح کو خدا بنانے کے لئے طرح طرح کے جھوٹ سے کام لیا۔ اور ان کے بڑے بڑے اسقف یہ اصل اپنے مدنظر رکھتے تھے جس کو یوسیبئس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ "میں نے وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جن سے ہمارے مذہب کا ظاہر ہو۔ اور ان تمام باتوں کو دبا دیا ہے جن سے ہمارے مذہب پر کسی طرح سے زو پڑتی تھی" پس ایسے ایسے حامیان دین کے ہوتے ہوئے جو کھلے طور پر اپنے اصول کو ان الفاظ میں بیان کرتے تھے ہم یقین کر سکتے ہیں کہ عیسائی مذہب کی جو تحریریں ہمارے ہاتھ میں ہیں ان میں بہ نسبت راستی کے جھوٹ زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے آدمی ہوئے جنہوں نے جھوٹی احادیث بنا کر مشہور کیں۔ مگر مسلمان علماء اور محدثین نے ان کے جھوٹ کو دین میں ملنے نہیں دیا اور ان جھوٹوں سے جن کے بنانے والے اکثر یا تو خود غرض تھے یا زندیق لوگ جو مذہب اسلام کو ان جھوٹوں سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ اہل اسلام نے اس وقت سے لیکر آج تک ہمیشہ بیزاری ظاہر کی ہے اور ان کے ناپاک جھوٹوں سے لوگوں کو بچانے کے لئے فی الفور کتابیں تصنیف کیں مگر مذہب کی ترقی کی خاطر جھوٹ بولنا جس کا پولوس اور اس کے بڑے بڑے جانشین اسقف فخریہ اقرار کرتے ہیں۔ اسلام ایسی ناپاکی سے ہمیشہ پاک رہا ہے۔ کیونکہ اس کے بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلے سے ہی اپنی امت کو متنبہ کر دیا تھا کہ جو شخص میرے نام سے جھوٹ بنائے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پس اسلام میں مذہب کی خاطر جھوٹ بنانا ایک سخت ناپاک جرم تھا مگر عیسائیت نے اس پر فخر کیا ہے۔ پھر جن لوگوں کے گھر میں یہ حالت ہو ان کو اسلام کے محقق محدثین پر اعتراض کرتے ہوئے شرم کرنی چاہیئے۔

امام بخاری کے لاکھوں حدیثوں میں سے ایک کو لینے کے معنی

یہاں میں اس بات کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ امام بخاریؒ نے جو چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف چند ہزار یعنی قریباً سات ہزار کو لیا۔ اور اس طرح گویا سو حدیث میں سے ایک کو لیا اور ننانوے کو ترک کر دیا تو اس کے کیا معنی ہیں کیا فی الواقع اس وقت موضوع احادیث کی اس قدر کثرت تھی کہ آپ کو سو میں سے ننانوے ترک کرنی پڑیں۔ اور ان ننانوے کو انہوں نے موضوع سمجھ کر ترک کیا۔ اور کیا فی الواقع وہ سب کی سب نابود ہو گئیں۔ اس سے تو یہ وہم پیدا ہوگا کہ واقعی محدثین کے زمانہ میں احادیث میں جھوٹ اس قدر مل گیا تھا کہ سو میں سے گویا ننانوے حصے جھوٹ تھا۔ یہ وہم بالکل فضول ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کے مرکز بہت تھے جہاں علیحدہ علیحدہ حدیث کا درس ہوتا تھا اور سینکڑوں کی تعداد میں حدیث کو ایک دوسرے سے روایت کرنے والے تھے۔ پس جب چھ لاکھ حدیث کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ فی الواقع اس قدر الگ الگ حدیثیں تھیں۔ ایک ہی حدیث کو جب ایک سلسلہ روایت سے بیان کیا جائے اور پھر اس کے سلسلہ رواۃ میں ایک آدمی کی بجائے دوسرا داخل ہو جائے تو یہ ایک علیحدہ حدیث سمجھی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم حدیث کا چرچا اس قدر تھا تو راویوں کے اختلاف کے لحاظ سے احادیث کی تعداد کا لاکھوں تک پہنچ جانا ایک معمولی امر تھا۔ لاکھوں حدیثوں کے ہونے سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر مختلف راوی اس وقت حدیثوں کے روایت کرنیوالے تھے۔ اب ان میں سے بہتیرے لوگ گمنام ہو گئے جن کے حالات کا پورا علم نہیں چلا۔ پس ایسی احادیث یعنی روایات مختلفہ کو محدثین نے ترک کر دیا۔ اسی اصول کے مطابق اب بھی صحیح بخاری میں جو احادیث مکرر آتی ہیں مگر ان کے سلسلہ روایت میں کہیں تبدیلی ہو گئی ہے تو اس کو ایک الگ حدیث گنا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد سات ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے ورنہ مکررات کو حذف کرنے سے یہ تعداد اڑھائی ہزار کے قریب رہ جاتی ہے۔

صحاح ستہ کے سوا دیگر کتب احادیث میں تنقید میں تساہل

صحاح ستہ کے بعد دوسری کتب حدیث کا مرتبہ ہے۔ ان کے جمع کرنے میں اس قدر قواعد تنقید کی سختی نہیں برتی گئی جیسے کہ صحاح میں اس لئے ان کتابوں میں ہر قسم کی احادیث شامل ہیں۔ البتہ یہاں بھی یہ احتیاط ضرور پائی جاتی ہے کہ جن احادیث میں مسائل دین بیان ہوئے ہیں۔ ان کی صحت کے پرکھنے میں زیادہ سختی سے کام لیا گیا ہے۔ اور جن احادیث میں قصص یا دیگر اخبارات یا اور امور ہیں ان میں زیادہ تر تساہل سے کام لیا گیا ہے کیونکہ اس کا کوئی چنداں اثر دین پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ بیہقی نے کسی دوسرے کا قول نقل کرتے ہوئے کتاب المدخل میں لکھا ہے اذا روینا عن النبی فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سھلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال۔ یعنی جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کے بارہ میں روایت لیتے ہیں تو سند میں سختی سے کام لیتے ہیں اور راویوں کو خوب پرکھ لیتے ہیں اور جب فضائل میں اور ثواب و عقاب کے متعلق روایت کرتے ہیں تو ہم سند میں نرمی سے کام لیتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔ ایسا ہی امام احمد بن حنبل ابن اسحاق کے متعلق لکھتے ہیں ابن اسحاق رجل تکتب عنہ ھذہ الاحادیث یعنی المغازی و نحوھا واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما ھکذا وقبض اصابع یدیہ الاربع یعنی ابن اسحاق

اس پایہ کے آدمی ہیں کہ یعنی مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں اور جب حلال اور حرام کے مسائل آئیں تو پھر ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے چاروں انگلیاں بند کرکے دبالیں (ماخوذ از سیرت النبی مصنفہ شبلی)

کیا ہم روایتہ یا درایت کی رو سے تنقید حدیث نہیں کر سکتے

اس بحث سے یہ ظاہر ہے کہ محدثین نے نہ صرف کامل طور پر تنقید روایت ہی کی ہے، بلکہ درایت کی رو سے بھی ایک حد تک تنقید کی ہے گو ان اصول کو جو انہوں نے احادیث موضوع کے پرکھنے کے لئے تجویز کئے بنظر احتیاط زیادہ وسعت نہ دی ہو لیکن ہمارے سامنے اب ایک نہایت ضروری سوال آتا ہے کہ آیا محدثین رحمہم اللہ کی کوششوں نے ہم کو بالکل تنقید احادیث سے مستغنی کر دیا ہے یہ دعویٰ ان بزرگوں کا نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ سلسلہ روایت کے ساتھ ہی حدیث کو بیان کرتے ہیں تاکہ آئندہ بھی کوئی اس پر تنقید کر سکے اور جس طرح باوجود محدثین کی ان تھک کوششوں اور کمال سعی کے سلسلہ روایت پر ہم اب بھی تنقید کر سکتے ہیں۔ اسی طرح درایت کی رو سے بھی ہم کسی حدیث کو زیر بحث لا سکتے ہیں۔ اصول درایت جن کو میں نے اوپر شاہ عبد العزیز صاحب کے نافعہ عجالہ سے نقل کیا ہے۔ دراصل محدثین کے قائم کردہ ہی ہیں ابن جوزی نے بھی قریب قریب یہی اصول بیان کئے ہیں۔ اور ان تمام احادیث کو موضوع کہا ہے جو عقل یا اصول مسلمہ یا محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہوں۔ ملا علی قاری نے موضوعات میں بھی اسی کے قریب اصول درایت بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ابن قیم الجوزیہ سے سوال کیا گیا کہ حدیث موضوع کا پتہ سوائے سند کو دیکھنے کے بھی لگ سکتا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ایسا شخص انکو پہچان سکتا ہے جو سنن صحیحہ سے خوب واقف ہو گویا وہ اسکے گوشت پوست میں داخل ہو چکی ہوں اور معرفت سنن میں اسے خصوصیت حاصل ہو چکی ہو۔ اور نبی کریم صلعم کی سیرت اور آپکے اخلاق سے وہ پورا واقف ہو۔ اور جانتا ہو کہ آپ کیا حکم دیتے ہیں اور کس بات سے روکتے ہیں اور آنحضرت صلعم کے حالات سے اسے ایسا شدید تعلق ہو چکا ہو کہ گویا اسے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح آپ سے مخالطت حاصل ہو چکی ہے تو ایسا شخص آپکے احوال اور اوامر اور نواہی کو خوب پہچان سکتا ہے اور اسکے بعد ان امور کلی کو بیان کیا ہے جن سے حدیث موضوع پہچانی جاسکتی ہے جن میں سے بعض وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ مگر چند خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کہ حدیث سنن صریحہ کے خلاف ہو۔ جیسے مثلاً یہ حدیث کہ جس کا نام محمد یا احمد ہو وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ آگ سے نجات اعمال پر ہے نہ ناموں پر یا القاب پر۔ یہ اصول دینی کے خلاف ہے۔

حدیث موضوع کا پتہ کس طرح لگ سکتا ہے

تنقید حدیث کے پانچ موٹے اصول

پس یہ ایک نہایت محکم اصول ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے کہ جو حدیث اصول دینی کے خلاف ہو وہ قبول نہیں کی جائیگی۔ ایسا ہی ایک اصول کلی یہ بیان کیا ہے کہ وہ حدیث جو واقعات یا مشاہدہ کے خلاف ہو

یعنی فی نفسہ باطل ہو۔ تیسرے قصوں کی احادیث ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں الاحادیث التی یذکر فیہا الخضر و حیاتہ کلھا کذب و لا یصح فی حیاتہ حدیث واحد یعنی وہ حدیثیں جنمیں خضر اور اسکی زندگی کا ذکر ہے سب کی سب جھوٹی اور اسکی زندگی کے متعلق ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔ ایسا ہی عوج بن عنق کے قد کی حدیثیں یہ کہ وہ ۳۳۳۳ گز لمبا تھا یا یہ کہ سمندر میں چلتا ہوا سمندر کی تہ سے مچھلی نکال کر سورج کے سامنے رکھکر بھون کر کھاتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی خرافات قصوں میں قصہ گو لوگوں نے داخل کر دی ہیں۔ اسی لئے بعض لوگوں نے یہاں تک لکھا ہے۔ کہ تفسیر کی کتابوں کا کوئی اصول نہیں جیسا کہ مغازی اور ملاحم کا کوئی اصول نہیں۔ کیونکہ سب قسم کے قصے جو مل گئے وہ بغیر تنقید کے ان میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ جو حدیث قرآن شریف کے صریح مخالف ہو۔ جیسے مثلاً وہ احادیث جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف علم غیب منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن شریف صاف فرماتا ہے قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ قرائن سے حدیث کا غلط ہونا معلوم ہو۔

روایت میں وہ حصہ جس میں قیاس کو دخل دیا گیا ہے

علاوہ ان تمام امور کے میں ایک خاص امر کے ذکر کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ حدیث میں اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس میں کچھ اقوال یا افعال یا مشاہدات ہوتے ہیں اور کچھ حصہ بعض وقت راوی کے قیاس کا داخل ہو جاتا ہے جس حصہ کی بنیاد قیاس پر ہے اس کو وہی وقعت دینی چاہیئے جو ایک صحابی یا دوسرے راوی کے قیاس کو دی جا سکتی ہے۔ بعض صحابہ اپنے اجتہاد میں کمال کو پہنچے ہوئے ہیں بعض اس سے کم مرتبہ پر ہیں سب کا اجتہاد یا قیاس یکساں طور پر قابل قبول نہیں۔ اور بعض وقت جو نتیجہ راوی نے کسی واقعہ سے نکالا ہوتا ہے وہ بالکل قابل قبول نہیں ہوتا۔ مثلاً بعض وقت حضرت ابوہریرہ کی روایات میں اصل بات کا ذکر کر کے آ جاتا ہے فاقرؤا ان شئتم تو یہ ان کا اپنا قیاس ہوتا ہے ایسا ہی اور جگہ بھی قیاس روایات میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ علمائے حنفی کا قول ہے کہ اگر راوی فقیہ نہ ہو جیسے حضرت ابوہریرہؓ کہ ان کا گو حفظ حدیث میں بڑا مرتبہ ہے مگر فقاہت میں وہ مرتبہ نہیں تو ایسی صورت میں بالمقابل قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ماہ کیلئے اپنی بیویوں سے علیحدگی کا معاملہ۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس علیحدگی کو بعض لوگوں نے طلاق سمجھ کر اسی رنگ میں معاملہ کو شہرت دے دی۔ یہاں تک کہ عموماً لوگوں نے سمجھ لیا کہ فی الواقع طلاق دے دی ہے حالانکہ امر واقع یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز طلاق نہیں دی تھی۔ چنانچہ خود حضرت عمرؓ نے آ کر آنحضرت صلعم سے بالصراحت یہ دریافت کر کے کہ کیا آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ اس معاملہ

کو صاف کیا۔ یا مثلاً جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فترت وحی کا ذکر کرتے ہوئے زہری نے یہ حصہ بڑھا دیا ہے کہ وحی کے رک جانے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے تھے تاکہ اپنے آپ کو گرا دیں اول تو خود اس واقعہ پر کوئی چشم دید گواہی نہیں۔ کیونکہ اس کی سند صرف زہری تک ہے جو ۵۰ ہجری میں پیدا ہوئے کسی صحابی تک نہیں پہنچائی گئی دوئم اس میں بھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امام زہری نے کسی صحابی سے سن کر ہی ایسا لکھا ہوگا تاہم اس حد تک تو مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ آپ پہاڑوں پر جاتے ہوں لیکن یہ امر کہ اس غرض کے لئے جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں محض کسی دیکھنے والے کا قیاس ہو سکتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ اور نیت پر کس طرح آگاہ ہو گیا۔ جس امر کا تعلق نیت اور ارادہ سے ہو اس کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں یہ قرآن وحدیث کے بھی خلاف ہے مگر اس وقت اس پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ پھر آپ پہاڑوں پر جاتے کیوں تھے تو میں کہتا ہوں جس غرض کے لئے غار حرا میں جاتے تھے مخلوق خدا کا درد دل میں بھرا ہوا تھا۔ وحی شروع ہو کر رک گئی اس گھبراہٹ میں عاشق کی طرح سرگرداں پھرتے تھے۔

تعامل میں آئی ہوئی احادیث اور دوسری احادیث میں فرق

پس حق یہ ہے کہ گو بخاری اور اس کے بعد باقی صحاح ستہ کی احادیث کا ہم بڑا مرتبہ یقین کرتے ہیں اور جو کچھ ان لوگوں نے احادیث پر تنقید کرنے میں کوشش کی اب ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمارے ہاتھ میں وہ سامان ہیں جن سے ہم ایسا کر سکیں۔ لیکن تاہم حدیث کی تنقید کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ نہ کسی بزرگ نے یہ کہا کہ احادیث کو جس حد تک ہم پرکھ چکے اس کے آگے قدم اٹھانا یا کوئی مزید تحقیق کر کے ان احادیث میں سے جن کو ہم نے صحیح سمجھا ہے کسی حدیث کو غلط قرار دینا گناہ ہے۔ ان بزرگوں نے ظن غالب سے ان احادیث کو صحیح سمجھا اور جن کو رد کیا ان کو بھی ظن غالب سے رد کیا۔ اب اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مجموعہ میں بہتیری احادیث ایسی ہیں جن کی صداقت پر تعامل امت نے مہر لگا دی ہے۔ اور اکثر مسائل دینی کے متعلق ایسی ہی احادیث ہیں کہ صحابہ نے نبی کریم صلعم کو ایک کام کرتے دیکھا اور اسی طرح کیا۔ صحابہ کے بعد میں آنیوالی نسل نے اسی طرح وہ کام صحابہ کو کرتے دیکھا اور خود کیا اور اس طرح پر یہ سلسلہ تعامل ہم تک پہنچا۔ جن احادیث پر اس صداقت کی مہر ہے۔ وہ یقین کے مرتبہ تک پہنچی ہوئی ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی احادیث ہیں جن میں فضائل یا قصص یا پیشگوئیاں یا حالات تاریخی وغیرہ امور درج ہیں۔ جو روزانہ زندگی میں ہر شخص کے کام آنے والی چیزیں نہیں۔ ان میں سے جن احادیث کو صحت کے ساتھ تواتر یا شہرت کا مرتبہ حاصل

ہے وہ بھی ایک اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بہتیری احادیث ایسی ہیں گو وہ صحاح میں ہی پائی جاتی ہیں۔ جن کو ان اصول تنقید کے ماتحت لایا جا سکتا ہے۔ جن کا ذکر خود محدثین نے کیا ہے اور جس طرح بلحاظ روایت وہ احادیث جرح کے ماتحت آسکتی ہیں اسی طرح بلحاظ درایت بھی جرح کے ماتحت آسکتی ہیں۔

روایت میں غلطی کا احتمال

یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ حدیث کو حفاظت قرآن کریم کا مرتبہ نہیں ملا اور نہ دنیا میں کسی اور کتاب کو ایسی حفاظت نصیب ہوئی۔ اعلیٰ پایہ کے محدثین نے بلا شبہ ایسے راویوں کو ترک کرنیکی کوشش کی ہے جو جھوٹ یا نسیان وغیرہ سے متہم ہوئے بایں خود بخاری کی اسنادوں میں بھی کئی ایک ایسے راوی ہیں جن پر جرح ہوئی ہے۔ اور دوسرے محدثین نے تو اس بارہ میں امام بخاری کے برابر سختی سے کام نہیں لیا۔ البتہ محدثین کی مجموعی شہادت بڑا وزن رکھتی ہے۔ کیونکہ ان سب نے الگ الگ اور اپنے طور پر تحقیق کی۔ لیکن علاوہ اس امر کے کہ کوئی راوی متہم ہو یا قوی نہ ہو۔ روایت کے سلسلہ میں اور بھی کئی مشکلات ہیں جنکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور اسی لئے یہ ضروری ہے کہ تعامل کی احادیث اور احادیث متواتر یا مشہور کو چھوڑ کر باقی احادیث میں بالخصوص ایسی احادیث میں جن میں قصص وغیرہ مذکور ہیں بہت احتیاط سے کام لیا جائے خود صحابہؓ نے بھی دوسرے صحابیوں سے باوجود اسکے کہ وہ انکو کذب سے متہم نہیں کرتے تھے احادیث کے قبول کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث آتی ہے جس میں ذکر ہے کہ میت کو پسماندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب کیا جاتا ہے تو وہ صاف فرماتی ہیں کہ بلا شبہ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا مگر ان سے خطا ہوگئی۔ آنحضرت صلعم نے کسی یہودی میت کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرمایا تھا کہ اس کے پسماندگان اس پر رو رہے ہیں حالانکہ اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایسا ہی قلیب بدر والی حدیث کے متعلق ہے۔ صحیح مسلم کتاب الجنائز۔ بخاری میں مذکور ہے کہ جب محمود ابن الربیع الانصاری نے عتبان بن مالک سے حدیث بیان کی جس میں آتا ہے۔ فان اللہ قد حرم علے النار من قال لا الٰہ الا اللہ یبتغی بذالک وجہ اللہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو آگ پر حرام کر دیا ہے جو لا الٰہ الا اللہ کہے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ایسا کرے۔ تو حضرت ابو ایوب انصاری نے یہ سن کر اس حدیث کے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرمایا واللہ ما اظن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما قلت قط خدا کی قسم میں یقین نہیں کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی وہ بات فرمائی ہو جو تم کہتے ہو یہ ایام جنگ کا واقعہ ہے۔ جب حضرت ابو ایوب بھی جنگ میں شامل تھے جس میں وہ شہید بھی ہوئے۔ بجائے کہانیاں سنانے کے اور بنانے کے

جیسا کہ میور کا خیال ہے یہاں محض قرائن کی بنا پر یک صحابی ایک حدیث کا انکار کر رہے ہیں) اور
خود محمود اس بارہ میں متامل ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے یہ عہد کیا کہ میں دوبارہ عتبان بن مالک سے
ضرور یہ سوال کروں گا جیسا کہ اسی حدیث میں مذکور ہے گویا انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے میں
ہی الفاظ کو ٹھیک ضبط میں نہ رکھ سکا ہوں (بخاری باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ) ایسا ہی حضرت
ابن عباس نے حضرت ابوہریرہ کی روایت کو قابل اعتراض جانا۔ جب انہوں نے کہا کہ جس چیز
کو آگ نے چھوا ہو اس سے وضو لازم آتا ہے۔ ترمذی باب الوضوء مما مست النار۔ اس قسم
کی اور بھی کئی مثالیں مل سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے اور کسی وقت ایسا بھی ہو
گیا ہے کہ ایک بزرگ جو حدیث کی حفاظت میں سخت محتاط ہیں ان سے بھی خطا ہو گئی ہے۔ اور جب
صحابہ تک میں یہ جائز ہے تو بعد کے بزرگوں میں بھی ایسا ہونا قرین قیاس ہے۔

روایت بالمعنی

علاوہ اس کے کہ روایت کے بیان کرنیوالے کو غلطی لگ سکتی ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ حدیث کی روایت میں روایت بالمعنی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف وہ
لوگ بھی ہیں جن کے الفاظ حدیث کو حیرت انگیز طریق پر محفوظ رکھنے کی شہادتیں ہیں۔ دوسری طرف
ایسے بزرگ بھی ہیں جو فرماتے ہیں کہ معنی کو محفوظ رکھنا کافی ہے۔ جامع ترمذی کتاب العلل میں ایسے
بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اگر یہ شہادتیں موجود ہیں کہ ابراہیم نخعی نے شہادت
دی کہ ابی زرعہ بن عمرو بن جریر نے ایک دفعہ مجھ سے حدیث بیان کی تھی پھر میں نے اس سے دو
سال کے بعد پوچھی تو اس نے ایک حرف بھی اس سے قطع نہ کیا۔ یا عبد الملک بن عمیر نے کہا کہ میں
حدیث بیان کرتا ہوں اور اس سے کوئی حرف چھوڑتا نہیں ہوں۔ یا قتادہ نے کہا کہ جو کچھ میرے
کانوں نے سنا ہے اس کو میرے دل نے نگاہ رکھ لیا ہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی قول ہے۔
فاما من اقام الاسناد وحفظہ وغیر اللفظ فان ھذا اوسع عند اھل العلم اذا لم
یتغیر المعنی۔ یعنی جو کوئی اسناد کو قائم رکھے اور اس کو یاد رکھے اور الفاظ کو بدل دے۔ تو یہ
صورت اہل علم کے نزدیک بہت فراخ ہے بشرطیکہ معنی متغیر نہ ہوں۔ یا واثلہ بن اسقع کا قول اذا
حدثناکم علی المعنی فحسبکم جب ہم تم سے حدیث بالمعنی کریں تو یہ تمہارے لئے کافی ہے۔
یا محمد بن سیرین کا قول کنت اسمع الحدیث من عشرۃ اللفظ مختلف والمعنی واحد۔ یعنی میں
دس آدمیوں سے حدیث سنتا تھا۔ الفاظ مختلف ہوتے تھے اور مطلب ایک ہوتا تھا۔ یا ابن
عون کا قول کہ ابراہیم نخعی اور حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔ یا حسن کا قول کہ جب تم

اصل مطلب حدیث کا پالو تو وہ کافی ہے۔ اذا اصبت بالمعنی اجزاک۔ یا سفیان ثوری کا قول ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت فلا تصدقونی انما هو المعنی۔ اگر میں تم کو کہوں کہ میں تم سے بعینہٖ وہ بات کرتا ہوں جو میں نے سنی تو میری تصدیق نہ کرو۔ وہ صرف معنی ہوتا ہے۔ اور وکیع کا قول ہے ان لم یکن المعنی واسعًا فقد هلك الناس اگر حدیث بالمعنی کی وسعت نہ ہوتی تو لوگ ہلاک ہو جاتے۔ پس معلوم ہوا کہ اگر ایک طرف حدیث کے الفاظ کو بعض حالات میں یاد رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرف کثرت سے یہ شہادت بھی موجود ہے کہ صرف مطلب کو بیان کر دینا بھی کافی سمجھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث میں جن کا تعلق اہم مسائل دینی سے ہے الفاظ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور دوسری احادیث میں بالمعنی روایت کر دینی بھی کافی سمجھی گئی ہے۔

صداقت حدیث کے پرکھنے کے لئے سب سے بڑا معیار

پس باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے بھی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اسی لئے بہت سے بزرگ حدیث کے نقل کرنے میں بہت محتاط پائے جاتے ہیں۔ ابن ماجہ کے باب التوقی فی الحدیث میں عمرو بن المیمون سے روایت ہے کہ وہ بلاناغہ ہر پنجشنبہ کی شام کو حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس جاتے تھے (کیونکہ آپ جمعرات کے دن وعظ کیا کرتے تھے)، اور انہوں نے کبھی حضرت عبداللہ کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا اور پھر لکھا ہے کہ ایک دن ایسا انہوں نے کہا تو بہت ہی مضطرب ہوئے اور فرمایا کہ شاید آپ نے اس سے کچھ کم فرمایا یا زیادہ یا اس کے قریب قریب یا اس کے مشابہ۔ ایسا ہی اسی باب میں محمد بن سیرین سے یہ روایت ہے کان انس بن مالك اذا حدث عن رسول الله صلی الله علیه وسلم حدیثا ففرغ منه قال اوكما قال رسول الله صلى الله علیه وسلم یعنی انس بن مالک۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان فرماتے تو آپ گھبرا جاتے اور کہتے کہ یوں فرمایا یا جیسا رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہو۔ اور اسی وجہ سے بعض صحابہ بہت کم حدیث بیان کرتے تھے۔ پس اگر ایک طرف حدیث کی عزت کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے تو دوسری طرف چونکہ ایک بات کے درست طور پر نہ پہنچنے سے یا ایک بات کے بھول جانے سے یا الفاظ میں ادل بدل یا کمی بیشی ہو جانے سے غلطی کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان احادیث میں بھی جن کو صحیح کہا گیا ہے۔ اور بالخصوص اس حصہ میں جس پر تعامل کی مہر صداقت نہیں لگی یا جس کو تواتر یا شہرت کا مرتبہ نہیں ملا۔ ایک اس سے بلند تر معیار کی ضرورت ہے جو ظن سے

سے بالکل پاک ہو۔ اور جس میں ادنیٰ شک کا بھی احتمال نہ ہو۔ اور یہ معیار خدا کے فضل سے ہمارے ہاتھ میں موجود ہے اور وہ قرآن شریف ہے جس کے متعلق نہ صرف اس کی حفاظت کا ہی ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ بلکہ اس کے اندر سارے اصول کو واضح اور محکم الفاظ میں بیان کرکے ایک ایسا معیار ہمارے ہاتھ میں دے دیا جس کے ہوتے ہوئے ہم حق و حکمت کی راہ سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔

قرآن کو حدیث پر مقدم کرنے کی ضرورت

پس درایت کی رُو سے حدیث کو پرکھنے کے لئے سب سے بڑا معیار ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ہے جو تمام شکوک اور ظنوں کی آمیزش سے پاک ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی یقینی اور قطعی کلام نہیں۔ وہی اصل بنیاد ہے۔ اور ہر ایک چیز سب سے پہلے اسی پر پرکھی جائے گی۔ قرآن شریف تمام اسلامی فرقوں کے ہاتھ میں ایک ہے۔ روایات میں اختلاف ہے۔ قرآن کریم کی جو حفاظت ہوئی وہ حدیث کی نہیں ہوئی اور بوجہ وحی متلو ہونے کے اس کا مرتبہ بھی حدیث سے بڑھ کر ہے اور وہ سب پر مقدم ہے۔ خود صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی احادیث کو قرآن شریف پر پرکھا ہے۔ بلکہ حضرت عائشہ نے قرآن کریم کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ارشاد فرمانے پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب العلم میں ابن ابی ملیکہ کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق ہے کانت لا تسمع شیئا لا تعرفه الا راجعت فیه یعنی آپ کوئی بات آنحضرت صلعم کے منہ سے نہ سنتی تھیں جس کو آپ پہچانتی نہ ہوں مگر اس میں آپ سے مراجعت کرتی تھیں اور اسی حدیث میں آگے آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حوسب عذب جس کا حساب لیا گیا اس کو عذاب دیا جائیگا تو صدیقہ رض نے عرض کیا اولیس یقول اللہ عزوجل فسوف یحاسب حسابا یسیرا یعنی کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا کہ ایسے شخص کا حساب آسانی سے لیا جائے گا۔ تو یہاں حضرت عائشہ صدیقہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کو قرآن پر آپ کے روبرو عرض کیا۔ اور آپ نے بھی اس کا جواب جو دیا وہ یہی ہے کہ اپنے قول میں اور قرآن شریف میں تطبیق کرکے دکھائی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ تم میرے قول کو قرآن پر کیوں عرض کرتی ہو بلکہ اپنے ہی قول کی توجیہ فرمائی ذلک من نوقش الحساب یہلك یعنی جس سے سختی سے حساب لیا جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا گویا بتا دیا کہ من حوسب سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے سختی سے حساب لیا جائے گا۔ پس معلوم ہوا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بھی قرآن شریف کو مقدم کرتے تھے۔ اور حفظ مراتب یہی چاہتا ہے کہ قرآن شریف کو ہر چیز پر مقدم کیا جائے کیونکہ اس کو وحی متلو ہونے کا بلند مقام حاصل ہے جو حدیث کو

حاصل نہیں۔ اسی طرح پر جب حضرت عائشہ کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے
مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو آپ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی ولا تزروا زرۃ وزرا خریٰ کوئی
بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا گویا اس سے یہ استدلال کیا کہ نوحہ کرنے والوں
کے گناہ کا اثر مردہ پر کس طرح پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ قرآن شریف کے مخالف ہے جس کے رو سے ایک
کا بوجھ دوسرے پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں یہ واقعہ کتاب الجنائز میں مذکور ہے کہ جب حضرت
ابن عمر کی یہ بات حضرت عائشہ صدیقہ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے آیت قرآن کو پیش کرنے
کے بعد یہ بھی فرمایا انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ یعنی
تم ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہو جو نہ جھوٹے ہیں اور نہ جھٹلائے گئے ہیں لیکن بعض وقت
سننے میں خطا ہو جاتی ہے ایسا ہی اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے کہا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک یہودی عورت کے متعلق یہ لفظ فرمائے تھے جس کا نوحہ کیا جا رہا تھا
انھم لیبکون علیھا وانھا لتعذب فی قبرھا۔ یہ اس پر روتے ہیں اور اس کو قبر میں عذاب ہو رہا
ہے۔ ایسا ہی واقعہ قلیب بدر والوں کے سننے کے متعلق لکھا ہے یعنی کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک مقتولین کے متعلق فرمایا تھا انھم لیسمعون ما اقول یعنی وہ سنتے
ہیں جو میں کہتا ہوں تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ان کو ٹھیک یاد نہیں رہا۔ آپ نے کہا تھا انھم
لیعلمون ان ما کنت اقول لھم حق وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ میں ان کو کہتا تھا وہ سچ نکلا اور پھر حضرت
عائشہ رضؓ نے یہ آیت پڑھی انک لا تسمع الموتیٰ تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ ان روایات کے متعلق
ہمارا کچھ بھی خیال ہو یہ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ نے قرآن شریف پر حدیث کو عرض کیا اور جہاں ظاہر
طور پر اس کو مخالف پایا تو حدیث کو صحیح نہیں سمجھا۔ ایسی ہی اور بھی کئی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا
ہے کہ صحابہ رضؓ جب کسی روایت کو قرآن شریف کے خلاف سمجھتے تھے تو اسے ترک کر دیتے تھے۔

اس معیار سے نہ ہم صرف مسائل کے متعلق احادیث کی صحت کو ہی پرکھ سکتے ہیں بلکہ تاریخ کے
متعلق سیرت کے متعلق اور قصص کے متعلق بہت سی باتوں کے حل کرنے میں قرآن شریف ہمیں ایسی
راہ پر چلاتا ہے کہ انسان ٹھوکر سے بچ سکتا ہے۔ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں۔ اجمالاً میں چند باتوں کا
ذکر کرتا ہوں۔ قرآن شریف خود فرماتا ہے ان علینا جمعہ قرآن کریم کو جمع کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا
اپنا کام ہے۔ اور فرماتا ہے انا لہٗ لحافظون۔ ہم قرآن شریف کی تحریف سے حفاظت کریں گے۔
لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ باطل اس میں دخل نہیں پا سکتا۔ پس اگر کسی حدیث

کا یہ مضمون ہو کہ فلاں آیت یا سورت قرآن شریف میں ہوتی تھی۔ جواب نہیں تو وہ حدیث غلط ہے مثلاً صحیح مسلم کی وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ قرآن شریف میں کوئی سورت ہوتی تھی جس میں یہ لفظ آتے تھے لوکان لابن آدم وادیان من مال لابتغی وادیا ثالثا ولا یملا جوف ابن آدم الا التراب یا وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن شریف میں عشر رضعات کا ذکر تھا۔ پھر پانچ کا (مسلم کتاب الرضاع) اسی قسم کی دوسری احادیث باوجود مسلم میں ہونے کے قابل قبول نہیں ہیں۔ اور نہ صرف قرآن شریف سے ہی ان کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری احادیث بھی جو تعداد میں زیادہ اور معتبر بھی زیادہ ہیں۔ ان کی تردید کرتی ہیں۔ یا مثلاً قرآن شریف حضرت ابراہیم کے متعلق فرماتا ہے انہ کان صدیقا نبیا وہ صدیق نبی تھا اور صدیق اس کو کہتے ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور ایک حدیث کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ تو وہ حدیث قابل قبول نہیں۔ اس نبی کی طرف جس کو قرآن شریف صدیق کہتا ہے جھوٹ منسوب کرنے سے یہ بہت سہل ہے کہ ایک راوی کی طرف غلطی یا جھوٹ کو منسوب کیا جائے جیسا کہ علامہ مازری نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے جس میں ہے کہ حضرت عباس نے حضرت علی کے متعلق یہ لفظ کہے تھے اقض بینی وبین ھذا الکاذب الآثم الغادر الخائن علامہ مازری کہتے ہیں اذا انسدت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها یعنی جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے (نووی شرح مسلم) پس اگر حضرت علیؓ کو جھوٹا کہنے کی بجائے راویوں کو جھوٹا کہنا انسب ہو تو حضرت ابراہیم کو جھوٹا کہنے کے بجائے کیوں راوی کو جھوٹا یا غلطی پر نہیں کہا جا سکتا۔ یا مثلاً قرآن شریف صاف فرماتا ہو کہ ہدایت ہمیشہ بنی آدم کیلئے اترتی رہی اور وہی اسکے مورد رہے نہ دیگر حیوانات تو اب ایک حدیث اگر یہ بیان کرے کہ ایک بندر کو دوسرے بندروں نے زنا کرنے کے جرم میں سنگسار کیا تھا تو اس حدیث کو غلط کہا جائے گا گو وہ بخاری میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور فی الحقیقت یہ حدیث تو عام عقل انسانی کے بھی خلاف ہو یا مثلاً جب قرآن کریم اول سے آخر تک بتوں کی مذمت سے بھرا ہوا ہے۔ اور کوئی حدیث یہ کہے کہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعریف بھی کی تھی۔ اور تلک الغرانیق العلی۔ ان کے متعلق نازل ہوا تھا تو ایسی حدیث پھینکنے کے قابل ہے۔

خود حدیث سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کیا جانے کا ثبوت

علاوہ ان استدلالات کے جو صحابہ رض کے عمل سے اوپر کئے گئے ہیں جن سے قرآن شریف کا حدیث پر مقدم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد میں ایک حدیث ہے جو

ہمارے مدعا کو صفائی سے صحیح ثابت کرتی ہے یعنی یہ کہ قرآن شریف کو حدیث پر مقدم کرنا ضروری ہے۔ ترمذی اور ابو داؤد نے حضرت معاذ بن جبل سے ذیل کی حدیث روایت کی ہے۔ عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد رائی ولا الو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ یعنی معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف (حاکم بنا کر) بھیجا۔ آپ نے فرمایا۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے آئے تو کس طرح فیصلہ کیا کرو گے۔ انہوں نے عرض کیا میں اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ۔ عرض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ پاؤ۔ عرض کیا تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا سب تعریف اللہ کیلئے ہے جس نے رسول اللہ کے رسول کو وہ توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔ اس حدیث سے نہ صرف صحابہؓ کا عمل ہی قرآن شریف کو مقدم کرنے کا صراحت سے ثابت ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر یہ بات بیان کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف الفاظ میں اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ خود آپؐ نے ہی صحابہؓ کو یہ طریق بتایا تھا کہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے اول قرآن کریم کو دیکھو اس کے بعد حدیث کو اور اس کے بعد خود اجتہاد کرو۔ گویا جو مرتبہ اجتہاد کو بمقابلہ سنت یا حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہے وہی حدیث یا سنت کو بمقابلہ قرآن کریم حاصل ہے۔ یہ حدیث اس سوال کا ہمیشہ کے لئے قطعی طور پر فیصلہ کرتی ہے۔ اور اہل حدیث کے اس گروہ کی غلطی پر بیّن دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف بغیر حدیث کے ہماری سمجھ میں ہی نہیں آسکتا۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے فروعی مسائل میں اور بہت سی تفصیلات دینی میں قرآن شریف کے ساتھ ہم کو حدیث کی بھی ضرورت ہے مگر یہ درست نہیں کہ بغیر حدیث کے قرآن شریف ہمیں کچھ کام ہی نہیں دے سکتا ورنہ حضرت معاذ یوں نہ فرماتے کہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے میں قرآن شریف کی طرف رجوع کروں گا۔ وہاں صراحت سے نہ ملے تو پھر حدیث کی

طرف اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر رضامندی ظاہر فرماتے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں ہمارے دین کی بنیاد ہیں۔ مگر مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر نہ کرنا ویسی ہی غلطی ہے جیسے مؤخر کو بالکل ترک ہی کر دینا۔ ایک افراط ہے تو دوسری تفریط۔ اس تقدم کی طرف قرآن شریف نے خود بھی صفائی سے اشارہ کیا ہے کیونکہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت کو رسول کی اطاعت پر مقدم کر کے بیان کیا ہے۔ اور بار بار یونہی فرمایا ہے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول یا اطیعوا اللہ والرسول۔ پس یوں قرآن و حدیث دونوں خود تصریح سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کرنے کو ضروری ٹھہراتے ہیں٭

قرآن کریم احادیث کے نقص کا علاج کرتا ہے

غرض قرآن کریم ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا معیار حدیث کے پرکھنے کے لئے ہمارے ہاتھ میں دیتا ہے اور یہ ہمارے لئے مقام فخر ہے کہ اگر حدیث میں کسی قدر ظن اور احتمال کا پہلو ہے تو دوسرے مذاہب کی طرح وہ لاعلاج نہیں بلکہ اس ظن کو دور کرنے کے لئے ہمارے ہاتھ میں ایک نہایت قوی حربہ قرآن شریف موجود ہے جو شریعت کی اصلی بنیاد ہے۔ حدیث اپنی جگہ پر ہے۔ تعامل تواتر اور شہرت نے اس کے ایک حصہ کو یقین کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے لیکن اس کا باقی حصہ بھی جس میں نہایت قیمتی جواہر ریزے ہیں ایسا نہیں کہ ایک عقلمند انسان اسے یوں ہی پھینک دے وہ ایک عظیم الشان علم ہے وہ بہت سے علوم کا سرچشمہ ہے اس میں جو نقص نظر آتا ہے اس کی اصلاح کا سامان جہاں تک ہماری ضروریات متقاضی ہیں۔ قرآن کریم میں موجود ہے۔ یوں تو دنیا کے بڑے بڑے مفید علوم ظن کا حصہ اپنے اندر رکھتے ہیں خود علم طب کو لے لو۔ اس میں کس قدر ظن سے کام لیا جاتا ہے مگر وہ انسان صحیح الدماغ نہیں جو علم طب کو اس لئے پھینک دے کہ اس میں کچھ ظنیات بھی ہیں یہی حالت حدیث کی ہے بلاشبہ اس میں ظنیات بھی ہیں مگر جو شخص کوشش کرے گا وہ اس میں سے نہایت بیش قیمت معلومات نکال کر اسے دنیا کے لئے مفید بنا سکتا ہے۔

غور و فکر کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کا سامان اسلام میں رکھا ہے۔ قرآن کریم کا حالانکہ ایک ایک لفظ کامل صحت کے ساتھ یقین کے مرتبہ پر پہنچا ہوا ہے مگر وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک حصہ محکمات کا اور ایک متشابہات کا رکھا ہے۔ تا متشابہات پر غور کر کے انسانوں کے ذہن تیز ہوں۔ حدیث میں اگر فروع کی تفصیلات موجود ہیں تو کچھ حصہ ظن کا ساتھ رکھ دیا ہے تا کہ صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کچھ غور و فکر بکار ہو۔ حدیث پر قرآن کریم کو مقدم کر کے اصل گر بھی بتا دیا۔ باقی وجوہ جن سے حدیث پر جرح ہو سکتی ہے۔ خود محدثین نے بتا دی ہیں اور وہ تمام اصول ہمارے لئے ہادی راہ ہیں۔ لیکن ان میں سے میں نے ایک بات کو خاص طور پر اس لئے انتخاب کیا ہے یعنی حدیث کو قرآن کریم کے ماتحت کرنا کہ اس زمانہ

میں قرآن کریم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے اور اس لئے بھی کہ جہاں بعض لوگوں نے حدیث کے مرتبہ میں تفریط کی ہے دوسری طرف بعض نے قرآن کریم کے برابر اس کو مرتبہ دے دیا ہے۔ اور حفظ مراتب کو مدنظر نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر صرف و نحو منطق فلسفہ بیان کی الجھنوں میں کچھ علم دین کا چرچا نظر آتا ہے تو صرف حدیث کے رنگ میں قرآن کریم مسلمانوں کی درسگاہوں میں سے قریبًا مفقود ہی ہو چکا ہے۔ اگر کچھ پڑھایا جاتا ہے تو وہ بھی صرف و نحو کی خاطر۔ حالانکہ ہماری تمام ترقیوں کا راز اور ہماری تمام کامیابیوں کی جڑ صرف قرآن شریف تھا۔ اور اگر مسلمان پھر کچھ ترقی کر سکتے ہیں تو قرآن کریم کے ذریعہ سے ہی کر سکتے ہیں۔ اسی کے ماتحت اسی کی تفسیر کے رنگ میں حدیث کو پڑھ کر اور بے بنیاد قصوں کو جو تفاسیر میں داخل ہو گئے ہیں ترک کر کے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

تمّت

(مقبول عام پریس لاہور میں باہتمام منشی ذاکر حسین پرنٹر چھپی)

دیگر تصنیفات حضرت مولانا محمد علی صاحب ایم اے ایل ایل بی

(منظور شدہ ٹیکسٹ بک کمیٹی) **سیرت خیر البشر** (منظور شدہ ٹیکسٹ بک کمیٹی)

اس بے نظیر تصنیف میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ شروع کتاب میں عرب کا نقشہ دیا گیا ہے۔ ملک عرب کی جغرافی حالت اور اس کا تعلق دوسرے ممالک و اقوام سے بتایا گیا ہے۔ بعد میں تمام حصص دنیا میں مذہبی تاریکی اور روحانی فیض کا مفقود ہونا اور آپ کی بعثت کے پہلے اور بعثت کے موقعہ پر کے چند بڑے بڑے نشانات کا جو ظہور پذیر ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر بچپن سے لیکر اخیر عمر تک کے حالات درج ہیں۔ قیمت بجلد عہ ر مجلد عہ ر

تاریخ خلافت راشدہ۔ منظور شدہ ٹیکسٹ بک کمیٹی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا دوسرا ایڈیشن چار علیحدہ علیحدہ حصوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں حضرت ممدوح نے ثابت کیا ہے کہ خلفاء راشدین کا زمانہ بھی دراصل زمانہ نبوی کا نتیجہ ہے اور خلافت راشدہ کے چار مختلف زمانے مسلمانوں کو چار عظیم الشان سبق دیتے ہیں جو ہر حالت میں انکے خضر راہ ہیں۔ حصہ اوّل حضرت ابوبکرؓ قیمت ۵ ر۔ حصہ دوم حضرت عمرؓ ۶ ر حصہ سوم حضرت عثمانؓ۔ قیمت ۴ ر۔ حصہ چہارم حضرت علیؓ ۴ ر

جمع قرآن قرآن کریم کی جمع و ترتیب کے متعلق تمام تاریخی واقعات کو نہایت تحقیقات سے لکھا گیا ہے اور جو اعتراضات غیر مذاہب والے کیا کرتے ہیں ان کی تردید کی گئی ہے۔ قیمت مجلد عہ ر۔ بجلد ۱۲ ر

النبوت فی الاسلام اس میں نبوت رسالت محدثیت اور مجددیت پر مفصل بحث کیگئی ہے قرآن شریف، حدیث اور حضرت مرزا صاحبؑ کی کتب سے ثابت کیا گیا ہے کہ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئی۔ قیمت مجلد عا ر۔ بجلد عا ر

ملنے کا پتہ:- منیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور

مسیح موعود — اس میں سلسلہ عالیہ احمدیہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ سلسلہ احمدیہ کے متعلق تحقیق کرنیوالے کو اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت مجلد ۱۲؍ - بےجلد ۸؍

مقدمۃ القرآن — ہستی باریتعالیٰ پر دلائل قرآنی کو چار قسم پر تقسیم کرکے ہر ایک عنوان کے ماتحت کل آیات قرآنی کو جمع کیا گیا ہے۔ قیمت ... ۶؍

محمد مصطفیٰ — یعنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحعمری کے مختصر حالات۔ یہ کتاب غیر مسلموں میں مفت تقسیم کے لئے بہترین ہے۔ قیمت ... ۵

نکات القرآن — مصنف موصوف نے قرآن کریم کے پہلے پانچ پاروں کے تفسیری نوٹ چار حصص میں شائع کئے ہیں۔ قیمت حصہ دوم ۶؍ سوم ۱۰؍ چہارم ۸؍ اول ختم

آیت اللہ — جس میں مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے حضرت موعود سے مباہلہ کرنے سے فرار کا مفصل ثبوت دیا گیا ہے۔ قیمت ... ۳؍

مرأۃ الحقیقت — میاں محمود احمد امام جماعت قادیان کے رسالہ حقیقت الامر کا جواب۔ قیمت ۵؍

حدوث مادہ — ایک آریہ سے مباحثہ جس میں ثابت کیا گیا ہو کہ مادہ حادث ہے۔ ۵؍

شناخت ماموریں — جس میں ماموریں من اللہ کے پرکھنے کے نشانات درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳؍

حقیقت المسیح — ایک عیسائی کے چند سوالات کے جواب ازروئے قرآن کریم اور بائبل نہایت مفصل طور پر دیئے گئے ہیں۔ قیمت ...

احمد مجتبیٰ — میاں محمود احمد صاحب کے عقیدہ کی کہ احمد رسول اللہ صلعم کا نام نہ تھا تردید کیگئی ہے۔ قیمت

حقیقت اختلاف — جماعت احمدیہ لاہور کی قادیان سے علیحدگی کس عقیدہ کی بنا پر ہوئی اس میں مفصل درج ہے۔ قیمت ... ۵؍

اسلام اور دیگر مذاہب یا فلسفہ مذاہب — حضرت مولانا مولوی محمد علی صاحب کی وہ معرکہ آرا تقریر جو آپ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ پر کی۔ قیمت ... ۱؍

ملنے کا پتہ:- منیجر دار الکتب اسلامیہ۔ احمدیہ بلڈنگس لاہور

(مقبول عام پریس لاہور میں طبع شد)